اسوۂ حسنہ

پروفیسر حمید احمد خاں
وائس چانسلر ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

کتابیات لاہور

اسوۂ حسنہ

پروفیسر حمید احمد خاں
وائس چانسلر ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

کتابیات لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ۱

طبع اول دسمبر ۱۹۶۶ء

ناشر : ولید میر
ناظم کتابیات لاہور

مطبع : مطبع عالیہ لاہور

مہتمم : سید اظہارالحسن رضوی

قیمت : تین روپے

انتساب

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور

اور

حضرت مولانا عبدالباری ندوی مدّ ظلّہٗ العالی

کے

فیضانِ تربیت

کے نام

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرۂ آفتابِ تابانیم
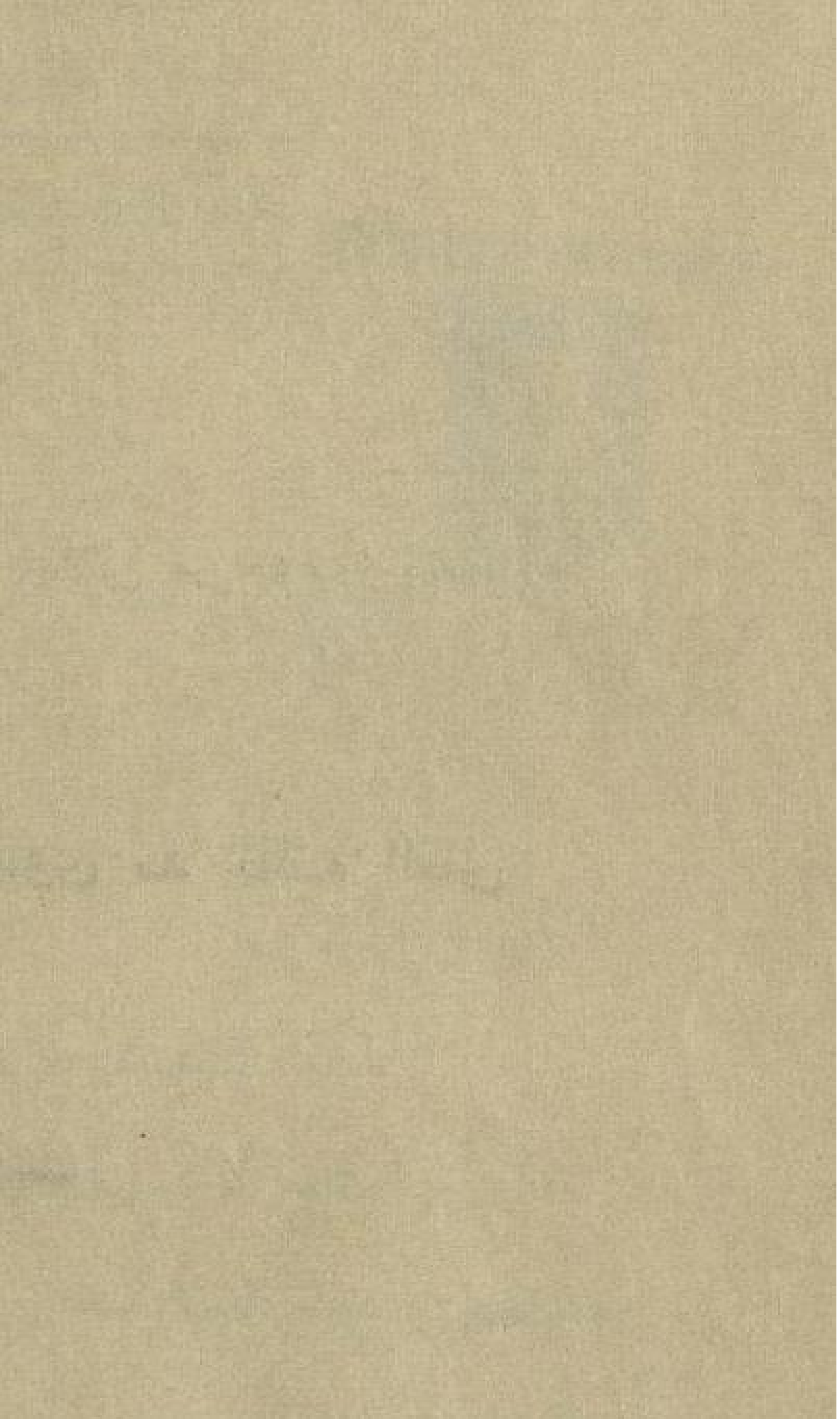
گزارش احوال

یہ طویل مقالہ برسوں پہلے میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں قلم بند کیا تھا۔ ان دنوں مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم، جو حیدر آباد دکن کے صدرالصدور امورمذہبی تھے، جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ سے ہر سال کسی اسلامی یا اسلامی و تاریخی موضوع پر مقالہ لکھواتے اور بہترین مقالے پر ایک سو روپے کا انعام عطا فرمایا کرتے تھے۔ جس سال میں مقابلے میں شامل ہوا مولانا نے اس انعامی مقابلے کے لیے "اسوۂ حسنہ" کا موضوع مقرر فرمایا تھا۔ میں نے ہفتوں، بلکہ مہینوں، کی کاوش سے یہ مفصل مقالہ تیار کیا جسے اب پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع کر رہا ہوں۔

علمائے کرام کی جس کمیٹی کے سامنے طلبہ کے یہ مقالات پیش ہوئے اس کے بیشتر ارکان نے غوروخوض کے بعد میرے مقالے کو اس بنا پر انعامی مقابلے سے خارج کر دینے کی سفارش کی کہ "یہ کسی طالب علم کا نہیں، بلکہ کسی عالم دین کا لکھا ہوا ہے"۔ حضرات علما کی یہ رائے میرے لیے دراصل ایک سندِ فضیلت تھی۔ لیکن اس وقت میں اپنے قصور فہم کی بنا پر بہت ناراض ہوا اور اپنی پیش کردہ تحریر کو مقابلے میں سے واپس طلب کرنے پر تیار ہو گیا۔ کمیٹی کے رئیس خود صدر الصدور صاحب تھے۔ انھوں نے (معاملے کی تحقیق کے لیے) چائے پر بلایا تو میرا جی چاہا کہ یہ دعوت قبول نہ کروں، مگر میرے استاد حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے مجھے سمجھایا کہ مولانا شروانی ایک

عالم اجل اور بڑے سنجیدہ و فہمیدہ بزرگ ہیں - ان سے ملنے میں کوئی قباحت نہیں ہے - الغرض میں نے اپنے شفیق استاد کے حکم کی تعمیل میں صدر الصدور صاحب کے دولت کدے پر حاضری دی - یہ ملاقات بہت پرلطف رہی - بہت سی باتیں ہوئیں مگر کسی قسم کی قلمی دراز دستی کا ذکر تک نہ ہوا - اگر پوچھا گیا تو یہ پوچھا گیا کہ عربی زبان کی تحصیل میں نے کہاں کی؟ اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کا مطالعہ کس حد تک کیا؟ میرے جواب یہ تھے کہ میں عربی مطلق نہیں جانتا، ابوالکلام کی نثر میں نے نہیں پڑھی، البتہ مولانا ظفر علی خان کی تحریریں ضرور دیکھی ہیں - میرے واجب الاحترام میزبان نے میرے حسن نگارش اور میری وسعت مطالعہ کا شفقت آمیز ذکر کیا تو میں نے بہ ادب عرض کیا کہ اگرچہ میں نے عبارت آرائی میں محنت کی ہے مگر میرا مطالعہ بہت محدود ہے - اس ملاقات کے دوران میں مولانا مناظر احسن گیلانی بھی موجود رہے - دو ایک دن بعد میں نے سنا کہ صدر الصدور صاحب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مضمون میں نے کسی سے نہیں لکھوایا، خود لکھا ہے - اور آخرکار وہ دن بھی آیا کہ چاندی کے سو روپے ایک ریشمی تھیلی میں، جو بیگم صاحبہ حبیب الرحمٰن خان شروانی نے بدست خاص تیار کی تھی، میرے حوالے کر دیے گئے -

نوجوانی کی اس تحریر کو چالیس بیالیس برس بعد موجودہ صورت میں شائع کرنے کا خیال ایک تو اس قدر و منزلت کی بنا پر پیدا ہوا جو حسب تفصیل مذکورۂ بالا اسے روز اول سے نصیب ہوئی - دوسرے اس بنا پر کہ ۱۹۲۶ء میں جب اس مقالے کی اشاعت پہلی مرتبہ رسالہ "ہمایوں" کے تین

مسلسل شماروں میں ہوئی تو اہل الرائے اصحاب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ میں نے یہ بھی سنا کہ بعض موقر رسائل (مثلاً "نظام المشائخ") نے "ہمایوں" کے صفحات سے اسے تمام و کمال نقل کیا۔

بایں ہمہ اپنی نوعمری کی اس تحریر کی خامیاں مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ اس کتاب کے اسلوب بیان میں لفظوں کی فراوانی اور عبارت کی رنگینی اہل ذوق کے لیے بارخاطر ہوگی۔ میں اگر اپنے حق میں کوئی سفارش کر سکتا ہوں تو فقط یہ کہ جوانی کے آغاز میں مشکل نگاری خواہ مخواہ ایک فن لطیف معلوم ہوتی ہے۔ اور پھر اگر کسی انعامی مقابلے میں شریک ہونے کا سودا بھی لکھنے والے کے سر میں سمایا ہو تو آرائش بیان کا چٹخارا بجائے خود ایک مقصد بن جاتا ہے۔ اب سالہاسال گزر جانے کے بعد ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں اسوۂ حسنہ کے مطالب کو سلیس انداز میں ڈھالنے کی کوشش کرتا لیکن ذرا سے غور کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ لفظوں کے رد و بدل سے مضمون کی معنوی فضا لازماً متاثر ہوگی۔ یہ تمام مضمون ایک ابال کی کیفیت میں لکھا گیا تھا۔ اس کیفیت کو نئے لفظوں میں ادا کرنا اب میرے لیے ناممکن ہے۔ چنانچہ بالآخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ میرے ایام شباب کا یہ مسودہ اپنی اصل صورت میں من و عن شائع ہو۔

خطیبانہ اسلوب بیان سے قطع نظر، نفس مضمون کے وہ حصے جہاں تہذیب فرنگ پر تلخ و تند تنقید کی گئی ہے اب مجھے کسی قدر ترمیم کے محتاج نظر آتے ہیں۔ اس کا

مطلب یہ نہیں ہے کہ تہذیب فرنگ فی نفسہ اب مجھے قابل قبول نظر آنے لگی ہے لیکن اس سے برأت کا اظہار کرنے میں اب میرا انداز وہ نہیں رہا جو چالیس برس پہلے تھا۔ تاہم، جیسا اوپر عرض کر چکا ہوں، اسوۂ حسنہ کا اصل مسودہ بلا ترمیم شائع کرنا اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ نوجوانی کے اس بھڑکتے ہوئے الاؤ میں اصلاح کے قطرے ٹپکانا عملاً ناممکن ہے۔

تغیرات زمانہ نے اظہار رائے اور انداز بیان کے طریقے بدل دیے، مگر الحمدللہ کہ میری اپنی ذات کی اصل و حقیقت اور میرے ضمیر کی ماہیت انقلاب کے اس عمل سے محفوظ رہی۔ عشق رسول آج بھی میری گراں بہاترین متاع حیات ہے۔ محمد مصطفے صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا تصور اب بھی میرے دل و دماغ کو اسی طرح ایک حیات نو کا پیغام دیتا ہے جس طرح کبھی دور شباب کے لہو کو آگ بنا کر میری رگوں میں دوڑاتا تھا۔ چنانچہ گو اس کتاب میں مجھے جابجا اپنی تحریر کی خامیوں کا احساس ہے، مگر یہ بالکل واضح رہنا چاہیے کہ رسول اللہ کی ذات اقدس کے متعلق محبت و شیفتگی کا جو اظہار ان صفحات میں ہوا ہے وہ آج کے دن بھی اپنے اولیں ولولے کے ساتھ تازہ ہے۔

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی
عشق محمد بس است و آل محمد

حمید احمد خاں

سینیٹ ہال
پنجاب یونیورسٹی لاہور
۱۱ دسمبر ۱۹۶٦ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آسوۂ حسنہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ آسوۃ حسنۃ

——قرآن حکیم

''ہم جہالت و ضلالت کے قعر میں گرے ہوئے تھے - بت پرستی ہمارا کیش و آئین تھی - ہم مردار کھاتے اور فحش بکتے تھے - کوئی وصفِ انسانی ہم میں باقی نہ رہا تھا - اتنے میں خدا نے ہمیں میں سے ایک شخص پیدا کیا جس کی شرافتِ نفس ، صدق و تدّین اور صفائے باطن ہم پر خوب آشکار ہے - اس نے ہم کو توحیدایزدی کی دعوت دی ، بت پرستی سے روکا اور راست گفتاری کی تلقین کی - اس نے ہم کو نصیحت کی کہ امانت میں خیانت نہ کرو ، ابنائے جنس سے بہ رحم و رفق پیش آؤ ، حقوق ہمسائگی کی نگہداشت کرو ، عورتوں کو برا نہ کہا کرو ، یتیموں کا مال نہ کھاؤ اور گناہوں سے بچے رہو -''

——جعفر طیار رضی اللہ عنہ

وہ برق تجلی جو صبح آفرینش کو ازل کے افق پر جھلملاتی اور جگمگاتی ہوئی نظر آئی تھی ، سینا کے ذرے ذرے کو اپنی محشر خیز تڑپ سے بے قرار کرچکی تھی - اس

کا شعلۂ جمال ، شعیر کی فضا میں خاموشی سے چمک چمک کر ، ارض بنی اسرائیل کے پردۂ ظلمت پر اپنے منوّر نقوش چھوڑتا گیا تھا - اور اب وقت آپہنچا تھا کہ اس کی گیتی فروز لمعانیاں ابر غلیظ کے اس سیاہ سائبان کو جو فاران کی چوٹیوں پر چھایا ہوا تھا ، تار تار کر کے ایک نامتناہی چشمۂ نور کی طرح صفحۂ آفاق پر بہہ نکلیں -

آخر ظلمت چھٹ گئی اور نور آ گیا - ایک اُمّی کو کتاب دی گئی اور کہا گیا کہ اسے پڑھو - مگر اس نے جواب دیا کہ میں تو ناخواندہ ہوں اور پڑھ نہیں سکتا[1] - اس پر اس سے کہا گیا کہ اپنے خالق کا نام لے کر پڑھے[2] - اور اس کو وہ علم عطا کیا گیا جو اس سے پہلے کسی انسان کو نصیب نہ ہوا تھا - یہ علم ، عمل کا سامان بھی اسی طرح اپنے ساتھ لایا تھا ، جس طرح آفتاب اپنے نور سے ذرے ذرے کو تڑپاتا ہوا طلوع ہوتا ہے - اس محرم سرالاسرار اُمّی کے لیے علم حقیقی کی یہ شمع ہدایت قدم قدم پر اپنا نورانی پرتو ڈالتی تھی - اس کا علم اس کے عمل کا رہنما ، اور اس کا عمل اس کے علم کا آئینہ دار تھا - اس کی لائی ہوئی کتاب کا اس کی حیات طاہرہ سے مقابلہ کرو تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس کا علم و عمل ایک ہی حقیقت الٰہیہ کے دو رخ تھے - خدا نے اپنے کلام کی اس مکمل عملی تصویر کو دیکھا اور بنی نوع انسان کو یہ کبھی فراموش نہ ہونے والا پیغام دیا :

---

۱ - صحیفۂ یسعیاہ ، باب ۲۹ : ۱۲

۲ - قرآن مجید ، سورۂ علق -

لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الآخر وذكر الله كثيراً ۔	بلا شبہ تم میں سے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ اور روز قیامت سے ڈرتے اور کثرت سے یاد الٰہی کرتے رہتے ہیں، رسول خدا (کی زندگی) میں پیروی و اتباع کے لیے ایک عمدہ نمونہ ہے۔

اس ارشاد پاک میں اہل بصیرت کے لیے حسب ذیل نکتہ آموز مطالب و معارف مرکوز ہیں:

(ا) انسان اپنی اخلاقی صلاح و فلاح کے لیے کسی عمدہ نمونے کا محتاج ہے۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی یہ قابل تقلید نمونہ پیش کرتی ہے۔

(ج) صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امتیازی فخر حاصل ہے کہ خدا نے آپ کے متنوع اور محیط الکل حالات حیات نسلِ انسانی کی رہنمائی کے لیے بطور کامل و مکمل نمونے کے منتخب کیے، کیونکہ کلام مجید میں جہاں اور صلحا و انبیا کا مجاہدۂ حق سراہا گیا ہے وہاں ان کی مخصوص زندگی من حیث المجموع تمام بنی نوع انسان کے اعمال کا محور و مرکز قرار نہیں دی گئی۔

ان حقائق سہ گانہ کی دوسری شق تو اصولاً ہمارے اس مقالے کا موضوع ہے لیکن پہلی اور تیسری شق کے متعلق اس

گنجائش میں ایک اجمالی تبصرے سے زیادہ کی جگہ نکالنا نہ صرف دور از کار بلکہ غیر ممکن ہے ، کیونکہ اصل مقصود تو صرف یہی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے گزرا ہوا سماں ، مٹا ہوا نقشہ ، آنکھوں کے سامنے آجائے ــــــ

افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت

کائنات میں انسان سے زیادہ عجیب و غریب کوئی چیز نہیں - اس کا دل کس قدر اتھاہ گہرائیاں ، کس قدر بے پایاں وسعت ، اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے ! اخلاقِ انسانی کے عالم نیرنگ میں کتنے عظیم تنوعات اور کتنے مہیب تناقضات سے ہم کو دوچار ہونا پڑتا ہے ، اور ناممکن ہے کہ ہماری ہستی بے اختیار لرزنے نہ لگے جب یہ ہیبت افزا مگر عبرت ناک اور اثرانگیز حقیقت اپنی پوری عریانی میں اس کے سامنے آ جائے کہ اس عالم نیرنگ کی ناپیدا کنار فضا ایک طرف تو ان حدود کو بھی قطع کرتی ہوئی جو ملائک کی رسائی سے وراءالورا ہیں ، خود حریم ایزدی کی آستانہ بوسی پر ناز کر رہی ہے اور دوسری طرف اس کا سراغ ضلالت و معصیت کے ویرانے کی ان بھیانک تاریکیوں میں ملتا ہے جہاں شاید کبھی ابلیس لعیں کے قدم بھی نہیں پہنچے - کسی نے خوب کہا ہے :

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ وز حیواں
گر کند میل ایں شود بہ ازیں
ور کند میل آں شود کم ازاں

انسان کی فطرت جس کی تعمیر قدسیت اور بہیمیت کی متعارض قوتوں سے ہوئی ہے ، انہیں دو میں سے کسی ایک قوت کی شکست یا فتح پر انسان کو ''احسن تقویم'' کا تاج پہنا دیتی ہے یا ''اسفل سافلین'' کی خاکِ مذلت پر پٹخ دیتی ہے - اس میں کلام نہیں کہ ایمان و ہدایت کی صلاحیت ،

بمصداق فطرۃ اللہ التی فطرالناس علیہا ، خانوادۂ آدم کے ہر فرد کو ودیعت کی گئی ہے ، لیکن تاریخ نوع انسانی اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اقوام و ملل رہ رہ کر صراط المستقیم سے بھٹک گئی ہیں اور خطوات الشیطان کی پیروی کرنے لگی ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ بالعموم سرشتِ انسانی کا علوی یا سفلی عنصر ، اثرات ماحول سے منفعل ہوئے بغیر ، بطورخود ، اپنے مخصوص مظاہر کے ساتھ حیاتِ انسانی کے عرصۂ عمل میں بروئے کار نہیں آ سکتا - کیونکہ جس طرح شرار پیدا کرنے کے لیے پارۂ سنگ کو کسی بیرونی تہیّج کی ضرورت ہوتی ہے ، اسی طرح انسانی خصائل کو بھی اپنے اظہار کے لیے خارجی اسباب و عوامل کا منّت کش ہونا پڑتا ہے - یہی وہ کڑی شرط ہے جو انسان کی اخلاق زندگی کو حق و باطل کی اس قدر خوفناک رزمگاہ بنائے ہوئے ہے ، کیونکہ محرکات شر اس پر ہر طرف سے ہجوم کرتے ہیں اور اس کی روح کے حیوانی جزو کو ابھارتے اور برانگیختہ کرتے رہتے ہیں - انسان اس ہنگامے سے گھبرا کر کوئی سہارا ڈھونڈتا ہے ، مگر زبانی تعلیم سے اس کی تشفی نہیں ہوتی - اس کی فطرت کی افتاد ہی ایسی ہے کہ نصیحت کے بجائے ناصح کا عمل اسے زیادہ متاثر کرتا ہے - اس موقع پر برگزیدگان حق جو فیضانِ الٰہی کے مخصوص انوار سے بہرہ ور ہوتے ہیں ، اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں - ہر نبی ، بلکہ ہر مومن صادق ، اپنے ساتھ ایک عظیم الشان روحانی قوت لاتا ہے جو ایک صاعقۂ نور بن کر انسان کی ہستی کے عمیق ترین احساسات سے اس قیامت خیز طریقے پر متصادم ہوتی ہے کہ اس میں قرن ہا قرن تک ایک آسمانی لرزش چھوڑ جاتی ہے - یہ قدسی ہیجان خدا کی زندہ آواز بن کر

انسان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پیغام دیتا ہے ، اور اس کی روح کی ملکوتی کیفیات کو بیدار کر کے ان میں یہ ولولہ پیدا کرتا ہے کہ اپنے عملی ظہور سے اپنی زندگی کا ثبوت دیں - اس وقت محرکات شر کی عشرت اندوز تحریصات کی حقیقت اس نظر فریب گلزار سے زیادہ نہیں رہتی جس کا ہر خوش رنگ پھول زہراب میں بسا ہو اور جس میں ہر شاخ گل کے ساتھ ایک جاں ستاں افعی لپٹا ہوا ہو -

انسان کو کسی قابلِ اتباع نمونے کی ضرورت محض اسی لیے داعی نہیں ہوتی کہ وہ اس سے انفراداً اپنی حیات اخلاق کی رہنمائی کر سکے ، بلکہ اس مسئلے کی ایک اجتماعی حیثیت بھی ہے -

ہم اپنے معمولی مشاہدات سے اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے - اس کے اعمال و افعال ایک سلسلۂ وحدت میں مربوط ہوتے ہیں - ہماری مادی زندگی میں یہی جذبۂ مدنیت مختلف نظام ہائے حکومت کی صورت اختیار کرتا ہے - لیکن ہماری روحانی زندگی بھی ، جو مادیت کے عالمِ شہود سے منفصل نہیں کی جا سکتی ، کسی ایسے نظام سلطنت کی مقتضی ہے ، جو ہماری اخلاق ضروریات کا کفیل ہو سکے - اگر ہر انسان اپنے انفرادی فہم و ادراک کی مدد سے اپنی ذات کو کسی خاص آئین اخلاق کا پابند کر لے ، تو اس میں شک نہیں کہ وہ اس جرأت کے ساتھ جو خلوص و دیانت کی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے ، اپنے ضمیر کا سامنا کر کے یہ کہہ سکے گا کہ "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا" - لیکن مختلف اصول ہائے کار کا تصادم جو اس قسم کی غیر منظم زندگی کا اٹل نتیجہ ہے ، حیات انسانی

کی بساطِ تمدن کا تار و پود بکھیر کر رکھ دے گا ۔ کیونکہ مختلف عقول و افہام کے قائم کردہ نظریات اخلاق کا کسی ایک نقطۂ مرکزی پر مجتمع ہونا از قبیل محالات ہے ۔ جو فعل میرے معیارِ اخلاق پر پورا اُترے ، لازم نہیں کہ دوسروں کا اخلاق نصب العین بھی اس سے مطابقت رکھتا ہو ۔ میں ایک راہ عمل انتخاب کرتا ہوں تو مجھ جیسے دس دوسرے انسان ایک بالکل الگ راستہ اختیار کرتے ہیں ۔ لیکن مذہب کا کام تو ایک انسان کو دوسرے انسان سے قریب تر لانا ہے اورمن و تو کے ان باطل امتیازات کو مٹا کر نسل آدم کو ایک شیرازۂ اتحاد میں منسلک کرنا اس کے فرائض عالیہ میں داخل ہے ۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کو ایک مرسل من اللہ پورا کرتا ہے ۔ وہ ایک مجسم الٰہی ضابطہ ، ایک زندہ اخلاقی قانون بن کر دنیا میں آتا ہے ۔ اُس کے بنی نوع اُس کے اُسوۂ حسنہ کو دیکھتے ہیں ۔ اُس کے بے ریا خلوص کو دیکھ کر اُن کی فطرت کے نورانی عنصر کو تحریک ہوتی ہے اور ان کی ہیئت اجتماعی بلا جبر واکراہ اخلاق فاضلہ کے اس نمونے سے تشبہ پیدا کرنے کے لیے مضطرب نظر آتی ہے ۔ اس طرح انسان کے روحانی تمدن میں کہ اسی پر اس کے مادی تمدن کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں ، ایک انضباط اور وحدت رونما ہوتی ہے اور دینی و دنیوی ترقی کی راہیں ہر طرف کھل جاتی ہیں ۔

*

حکمیات طبیعی کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ ہمارے حاسۂ بصر کو سفید رنگ کا احساس سات مختلف لونی کیفیات کے امتزاج سے ہوتا ہے - یہ الوان سبعہ اپنی منفرد حیثیت میں بھی مخصوص فوائد رکھتے ہیں لیکن معمولی اور طبعی حالات میں انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ نور کی شعاع ہفت رنگ کی اس ترکیبی صورت کی طلب کرے جسے عرفِ عام ''سفید روشنی'' کے نام سے موسوم کرتا ہے اور جو تمام الوان معلومہ پر حاوی ہونے کے باوجود کسی ایک رنگ میں محدود و محصور نہیں -

انسان کی روحانی تاریخ اس طبیعی مسئلے کے ساتھ ایک عجیب دل پذیر مماثلت رکھتی ہے - قدیم الایام سے انبیائے کرام اپنی اپنی آمت کی رہنمائی اور خاص خاص مفاسد کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوتے رہے اور اس مقصد کو انجام دینے کی غرض سے دین بر حق کے خاص خاص پہلوؤں کو روشن کرتے رہے - کسی نے جن و انس اور مرغ و ماہی پر شہنشاہانہ فرماں فرمائی کی اور قوتِ ایمان کے کرشمے نمایاں کیے - کسی نے فقرو فاقہ میں زندگی کے دن گزارے اور ہجومِ مصائب کے مقابلے میں انتہائی صبر کا نمونہ پیش کر کے اہل تقویٰ کی شانِ درویشی کو آشکار کیا - کسی نے خدا کی تیغ جلال بن کر جہاد کا فرض ادا کیا ، اور کسی نے حلم اور آشتی کی مجسم تصویر بن کر طغیان و تمرد کو بھی تسلیم و رضا سے تسخیر کرنے کی تلقین کی - غرض ان نفوس قدسی میں سے ہر ایک نے دین فطرت

پر ایک مخصوص رنگ میں روشنی ڈالی ، لیکن یہ بظاہر متفاوت تعلیمات ایک ہی کل کے منتشر اجزا ، ایک ہی آفتاب کی متنوع للون تجلیاں تھیں - نور ازل کی ان ہزار رنگ شعاعوں کو ابھی ایک نقطۂ ماسکہ پر جمع ہونا تھا اور غار حرا سے نکلنے والے چاند پر اپنا عکس ڈال کر ، مشرق اور مغرب ، حال اور مستقبل ، کو یکساں طور پر اپنی ظلمت ربا فروغ افشانیوں سے منور کرنا تھا - مگر اس قول سے یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے انبیاء کی زندۂ جاوید تلقینات بجز ان کی اپنی قوم کے کسی دوسری انسانی جماعت پر صادق نہیں آ سکتیں ، یا کسی خاص دور کے گزر جانے کے بعد ان کے ارشادات کی صحت مشتبہ ہوگئی - وہ حقیقت کبریٰ جس کے جلووں سے زمین و آسمان سرشار ہیں ، صبحِ کن فکاں سے ایک چلی آئی ہے اور شامِ علیہا فان تک ایک چلی جائے گی ، لیکن اس میں کلام نہیں کہ انبیائے متقدمین کا ظہور مخصوص حالات میں مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے ہؤا تھا اور اس لیے لامحالہ ان کی زندگی اس عمومیت سے عاری ہے جو تمام نوع انسان کی تہذیب نفس اور تزکیۂ اخلاق کے لئے کوئی مکمل اور جامع ضابطہ پیش کر سکے -

حضور سرور کائناتؐ کے ظہور سے پہلے ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت قائم رہی کیونکہ کسی ایک فرستادۂ حق نے دین فطرت کو کامل اور مکمل نہ کر دیا تھا - زمانے نے تمام انبیا کی صرف اُن سنتوں کو محفوظ رکھا جن کے وہ مظہر کامل تھے اور جن سے انسان کو نفع پہنچا - یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر سے ہم ایک خاص ایمانی شان

منسوب کرتے ہیں ۔ حضرت یوسفؑ کی حیا و امانت ، حضرت ایوبؑ کا صبر ، حضرت ابراہیمؑ کی توحید پرستی ، حضرت عیسیٰؑ کا حلم و بردباری ، ان انبیائے کرام کی امتیازی نشانیاں ہیں ۔ مگر جنابِ خاتم النبیّین کے متعلق اس قسم کی تخصیص و تحدید سے کام نہیں لیا جاسکتا ۔ یہاں حیائے یوسف بھی ہے اور صبرِ ایوب بھی ، توحیدِ ابراہیم بھی ہے اور حلمِ مسیح بھی ۔ پھر جب دنیا نے دیکھ لیا کہ کوئی ایک ذات کس طرح بدرجۂ اتم ان متعدد صفات کی جامع ہوسکتی ہے تو بعثت انبیا کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا ۔

کچھ عجب نہیں کہ اگر منشائے ایزدی حضور ختم المرسلین سے قبل کے انبیائے کرام کے لیے وہ ماحول پیدا کردیتا جو سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو میسر ہوا تو وہ برگزیدگان خدا بھی اُن تمام صفات و کمالات کو نمایاں کرتے جن کا عملی ظہور عظیم تر مقاصد کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے ۔ لیکن انسانی احتیاج اور مصلحت کا تقاضا کچھ اور تھا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مصری کی ستم رانی کو دیکھتے ہیں اور اُسی وقت اُس کا خاتمہ کرکے اُسے کیفرِ کردار کو پہنچاتے ہیں [1] ۔ مگر جناب مسیح علیہ السلام کی تعلیم ہے کہ ”بدی کا مقابلہ نہ کرو بلکہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اُس کے سامنے کردو“[2] ۔ بادی النظر میں یہ تفاوت شاید تناقض معلوم ہو لیکن ارباب فہم و فکر

---

۱ - خروج ، ۲ -

۲ - متی ، ۵ : ۳۹ -

جانتے ہیں کہ نہ تو حضرت موسیٰ اور نہ حضرت مسیح (علیہما السلام) کی مقدس سنت صداقت سے خالی ہے - ایک میں خدا کی شانِ جلال اور دوسری میں شانِ جمال جھلک رہی ہے - ان مختلف شؤن الٰہیہ نے ابھی کسی ایک ذات کو اپنی تجلیوں کا مورد و مہبط نہیں بنایا تھا اور زمانہ ابھی جام الست کی اس گردش آخریں کا منتظر تھا جو تکمیل دین اور اتمامِ نعمت کی مئے طہور پلا کر بزم میں ایک ابدی نشاط چھوڑ جانے والی تھی - اس حقیقت کے بیان میں آگے چل کر زیادہ تفصیل و توضیح سے کام لیا جاسکے گا لیکن اس جگہ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ حضور خیرالانام علیہ السلام والتحیات کے اسوۂ حسنہ کی جامعیت ہی اس کا طغرائے امتیاز نہیں - بلاشبہ یہ امر بجائے خود کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی فقیری سے لے کر شہنشاہی تک کے تمام معاشرتی مراتب و مدارج پر حاوی ہے مگر اس بارے میں ایک اور خصوصیت بھی اس قابل ہے کہ اس کا لحاظ کیا جائے -

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ ، یا بہ روایت امام غزالی[۱] حضرت سعید بن ہشام رض نے حضرت عائشہ رض ، سے خلق نبوی کے متعلق سوال کیا تھا جس کا جناب صدیقہ نے یہ بلیغ جواب دیا کہ کان ُخلقہ' القرآن - اگر تم حضور ص کے اخلاق جمیلہ کا اندازہ قائم کرنا چاہتے ہو تو قرآن پر نظر ڈالو کہ قرآن اور محمد ص ایک ہی سرمدی صداقت کے دو رخ ہیں - چاہو تو ایک کو علم کا نام دو اور دوسرے کو عمل کا - ایک کو آفتاب ہدایت

---

۱ - احیاء العلوم - ربع ثانی ، کتاب العاشر - صفحہ ۳۳۵ -

کہو اور دوسرے کو اس آفتاب کی تجلی - اس نکتے کے بیان کر دینے کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ خدائے عزوجل نے انّا لہ لحٰفظون کا وعدہ فرماتے وقت گویا ذکر حمید ہی کے حفظ و صیانت کا پیغام نہ دیا تھا بلکہ سنت نبوی کے قیام و بقا کی بھی ضمانت دی تھی کہ یہ قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے - چنانچہ ہم آج فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی مذہبی پیشوا کے سوانح زندگی دنیا کو اس شرح و بسط کے ساتھ نہیں ملے کہ خفیف سے خفیف جزئی تفصیلات بھی نظر کے سامنے آگئی ہوں - انتظامِ امورِ خانہ داری سے لے کر اہتمام و انضباطِ سلطنت تک حیاتِ انسانی کا کون سا شعبہ ہے جس پر اسوۂ نبوت نے اپنے بےنظیر انداز میں روشنی نہیں ڈالی ! اور پھر ہمارے محدثین نے احادیثِ صحیحہ سے غلط اور موضوع احادیث کے طومارخرافات کو، جسے یہود و منافقین کی فتنہ انگیز ریشہ دوانیوں نے فراہم کیا تھا، الگ کرنے میں کس قدر جانکاہی اور کنج کاوی سے کام کیا ! امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے احادیث کی تنقیح و تحقیق میں ان کی صحت کا جو بلند معیار مقرر کیا تھا، وہ کسی بڑے سے بڑے محقق تاریخ دان کے لیے بھی موجب ناز ہوسکتا ہے - یہی سبب ہے کہ انھوں نے سولہ سال کی لگاتار محنت کے بعد چھ لاکھ حدیثوں میں سے مکرّرات کو چھوڑکر صرف چار ہزار حدیثیں اپنی کتاب میں لکھیں جو بجا طور پر اصحّ الکتب بعدالقرآن کہلاتی ہے - حضرت امام مالک نے کئی لاکھ حدیثیں اپنے بیٹے کو یاد کرائیں اور پھر پوچھا کہ "تم جانتے ہو ان حدیثوں کے یاد کرانے سے میری غرض کیا ہے" ؟ جواب ملا : "ہاں غرض یہ ہے کہ میں

سنت نبوی کو اپنی زندگی کا دستور العمل بناؤں" ۔ امام ممدوح نے فرمایا : "نہیں ، میرا یہ مقصد نہیں ۔ جو احادیث میں نے تمھیں حفظ کرائی ہیں ، سب موضوع اور غلط ہیں ۔ ان کے علاوہ اگر تمھیں کوئی اور حدیث ملے تو اس کی صحت یا عدم صحت پر پھر غور کرنا" ۔ تحقیق حق اور تنقید باطل کے لیے ائمۂ حدیث نے کس قدر حوصلہ آزما کاوش کی اور کس قدر صبر شکن صعوبتیں جھیلیں ! جس داستان کے سنانے والے عقیدت و خلوص اور ثقاہت و اعتبار کی ایسی گراں مایہ روایات کے حامل ہوں ، اس کی صحت و صداقت میں کسے کلام ہو سکتا ہے!

ان تمہیدی مباحث سے فارغ ہونے کے بعد اب ہم اصل مطالب کی طرف متوجہ ہوسکتے ہیں ۔ چونکہ اس مضمون کا موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہی نہیں ، بلکہ آپ کا اسوۂ حسنہ ہے ، اس لیے آپ کے مکارمِ اخلاق کے بیان کے ساتھ ساتھ لازماً ان برکات و فیوض کا بھی مجمل تذکرہ کیا جائے گا جو آپ کی پیش نمودہ مثال نے ملت زہرائے اسلامیہ کے واسطے سے دنیا کو پہنچائے ، ازبسکہ لفظ ''اسوہ'' کے مفہوم کا اطلاق اسی فعل پر ہوسکتا ہے جس کا کوئی تقلیدی پہلو بھی ہو ۔ اس مختصر مقالے میں اسوۂ رسالت کے ہر پہلو کے متعلق تشریح و تفصیل سے کام لینا ممکن نہیں ، تاہم جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا گیا ہے کہ

کان یخطب فی کل وقت بما تقتضیہ حاجۃالمخاطبین و مصلحتہمُ

آپ ہمیشہ مخاطبین کی ضرورت و مصلحت کا لحاظ کر کے تقریر فرماتے تھے ۔

اسی طرح دورحاضر کی ضروریات کے اقتضا سے آپ کی حیات طاہرہ کے ان پہلوؤں کو نسبۃً زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی جو یورپ کی گمراہی کے ظلمت اندوز ہنگاموں پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوں ، یعنی ہم اپنے ہادی کے زندۂ جاوید تقدس سے ، انگریز شاعر سوئبرن کے ہم آہنگ ہو کر یہ التجا کریں گے کہ

''آ اور ہمیں تہذیب سے نجات دے'' !

جب حضور رسالت مآب علیہ الصلوۃ و التحیات نے ''الا تتقون انی لکم رسول امین،، کا پرانا سوال اپنی قوم کے سامنے دہرایا تو آنحضرت کو وہی جواب ملا جو قرون ماسبق کی امتیں ، اس سے پہلے کے مرسلین من اللہ کو دے چکی تھیں ۔ خدا کا آخری پیغام رساں پہلے تو سرمشق استہزا و استخفاف بنایا گیا ، پھر رفتہ رفتہ جب اس کی تحریک ربانی ایک بڑھتی ہوئی قوت کی صورت میں آشکار ہونے لگی تو اُسے ترغیب و تحریص کے سبز باغ دکھائے گئے ۔ اس کے بعد ترہیب و تخویف اور پھر ایذا و تشدد سے کام لیا گیا ۔ انجام کار ان طاغوتی سرگرمیوں کا تدریجی سلسلہ متعدد قاتلانہ منصوبوں کی شکل میں اپنے انتہائی نقطۂ طغیان کو پہنچ گیا اور اگر خدائے ذوالمنن کا احسانِ عظیم آڑے نہ آیا ہوتا تو دنیا کی تاریخ آج کچھ اور داستان سناتی ۔ لیکن لوحِ محفوظ پر یہ نقش ثبت ہو چکا تھا :

یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا
واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون کے نور کو اپنی پھونکوں سے
بجھا دیں ۔ لیکن خدا خود اپنے
نور کا اتمام کرنے والا ہے ،
خواہ کافروں کو ناگوار ہو ۔

وہ سماں بھی عجیب ہوگا جب حضور خاتم النبیّین نے اپنے اقربا کو دعوت طعام دے کر ایک جگہ جمع کیا اور پیغام الٰہی سنا کر اُن سے پوچھا تھا کہ ''تم میں سے کوئی ہے جو میرے ساتھ ہو؟'' اُس وقت تذبذب اور تحیّر کی خاموشی جو تمام مجلس پر چھا گئی تھی ، اس کا طلسم یک بیک جناب علی مرتضیٰ رضؓ کی پرجوش آواز نے توڑا تھا کہ ''یا رسول اللہ ! میں حاضر ہوں'' ۔ مجلس میں ابو طالب بھی موجود تھے جن کے سامنے کسی کو بیباکی یا گستاخی کی جرأت نہ ہو سکتی تھی ، لیکن ایک کبیرالسن ان پڑھ آدمی اور ایک نوعمر لڑکے کا دنیا بھر کے عقائد مروجہ کو پیغام جنگ دینا پورے مجمع کو اس قدر مضحکہ انگیز معلوم ہؤا کہ سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے[1] ۔ کوہ صفا کے دل نشین خطبے سے بھی یہی سلوک کیا گیا اور ابولہب کی شقاوت ''**اِنی نَذیرٌ لَکُم بین یدی عذاب شدید**'' کے ہمدردانہ پیغام پر ، بجز ایک سفیہانہ پھبتی کے ، اور کسی طرح اظہار شکریہ نہ کر سکی[2] ۔

مگر یہ تضحیک بہت جلد تردد کی صورت میں بدل گئی ۔ آنے والے واقعاتِ مہمہ جس طرح بعض دفعہ ہمارے ذہن پر پہلے سے اپنا عکس ڈال دیتے ہیں ، اسی طرح کفار قریش کو بھی بالآخر دین قویم کی چھپی ہوئی طاقتوں کے دھندلے سے تصور نے بیدار کیا ۔ کعبے کا بت خانہ جس کے وہ متولی تھے پورے عرب کی بت پرستی کا مرکز اور اس لحاظ سے ان کی

---

۱ ۔ ابوالفدا ۔ ص ۱۱۷ ۔

۲ ۔ بخاری ، جلد دوم ، ص ۲۷۳ ۔

دولت و ثروت اور رعب و اقتدار کا سرچشمہ تھا - یہی سبب ہے کہ بت پرستی قریش کو محض اپنے آبائی مذہب کی حیثیت سے عزیز نہ تھی، بلکہ اپنی دنیوی اغراض کے حصول کے لیے بھی وہ اس کے قیام و دوام کے آرزو مند تھے - چنانچہ ابراہیمؑ کے یہ فرزند اپنے جد امجد کی عبادت گاہ کو، جس کی پاسبانی الطاف ِ خداوندی سے انھیں کے حصے میں آئی تھی، مگر جسے ان کے ناسپاس ہاتھ صدہا سال تک ناپاک کرتے رہے تھے، بدستور نجاست شرک سے آلودہ رکھنے کے لیے بے قرار ہو گئے - اس کے بعد سے آنحضرت پر وہ خوفناک مظالم و شدائد شروع ہوئے جن کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں آنحضرت ہی برداشت کر سکتے تھے - کسی ایذا یا تشدد سے ہر شخص بقدر اپنی ذکاوت ِ حس کے متاثر ہوتا ہے، مثلاً ذرا سی سخت کلامی جسے ایک اخلاق باختہ مجرم ناقابل ِ التفات سمجھتا ہے، بسا اوقات کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے شدید کرب وعقوبت کا باعث ہوتی ہے - اس آخرالذکر افتاد مزاج کے لوگوں کو دنیا میں سب سے زیادہ صدمات برداشت کرنے پڑتے ہیں کیونکہ زمانے کا نامہربان اور درشت ہاتھ اُن کے دل کو مسلتا اور مجروح کرتا رہتا ہے - یہ تو عوام کی قلبی کیفیت ہے جسے پیغمبر کی صفائے قلب سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی - خود آنحضرت کی ذکاوت ِ حس کی یہ کیفیت تھی کہ دوسروں کے سطحی اور معمولی جذبات و احساسات کو بھی خفیف سے خفیف ٹھیس پہنچانا آپ کو گوارا نہ تھا - لوگوں کے پاس خاطر کو اس حد تک ملحوظ رکھتے تھے کہ جب کسی شخص سے ملتے تو مصافحے میں تقدیم کرتے اور جب تک وہ خود ہاتھ کھینچ نہ لیتا آنحضرت بھی اُس کا ہاتھ نہ چھوڑتے -

وعظ و نصیحت سے آنحضرت کی غرض اپنی امت کی فلاح و بہبود
کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی ؟ مگر بخاری میں ابن مسعود
سے روایت ہے کہ آنحضرت ہم لوگوں کو ناغہ دے کر نصیحت
فرماتے تھے تا کہ ہم اکتا نہ جائیں ۔ سائل کا سوال آپ رد نہ
فرماتے تھے اور آپ کی انتہائی نزاکت ِ حس کی یہ کیفیت تھی کہ
نادار کو دینے کے لیے اگر کبھی کچھ پاس نہ ہوتا تو اس انداز میں
عذرخواہ ہوتے گویا اپنے کسی قصور کے لیے معافی مانگ
رہے ہیں ۔ حضور کے عظیم رحم و رفق اور بے مثال محبت و شفقت
کا قیاس اس ایک واقعے سے کرو کہ جب کوئی خطاوار
آپ کے سامنے آ کر عفو کا طالب ہوتا تو خود آپ کی گردن مبارک
شرم سے جھک جاتی ۔ اس قسم کی حسّاس طبیعت کو ذرا سی
بے مہری ، خفیف سی کج ادائی بھی انتہائی درد و کرب میں
مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے ۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر
ہم زیادہ واضح طور پر اس بات کا اندازہ کر سکیں گے کہ
اشاعت ِ دین ِ حنیف کے لیے جو کش مکش آپ کو کرنی پڑی ،
وہ کس قدر جاں گسل تھی اور آپ نے اس تمام ہنگامے میں
ماتھے پر بل لائے بغیر تسلیم و رضا کی جو شان دکھائی ، وہ
فی الحقیقت انھیں الفاظ ربانی کی مستحق تھی :

قل ان صلاتی و نسکی و
محیای و مماتی لله رب العالمین
لا شریک له و بذالک
امرت و انا اول المسلمین

(اے پیغمبر ! لوگوں سے)
کہہ دے کہ بے شک میری نماز
اور میری عبادت اور میری زیست
اور میری موت سب رب العالمین
ہی کی راہ میں ہیں جس کا

کوئی شریک نہیں - مجھے اس
کا حکم دیا گیا ہے اور میں
اس کے فرمانبرداروں میں پہلا
فرمانبردار ہوں -

آپ اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکالنا چاہتے تھے اور آپ کی قوم نے اس دل سوزی کا صلہ یہ دیا کہ آپ کو گالیاں دیں ، راستے میں کانٹے بچھائے، جسم مبارک پر نجاستیں ڈالیں - اس کے جواب میں آپ صرف اس قدر فرما دیا کرتے تھے کہ ''فرزندان عبد مناف ! حق ہمسائگی خوب ادا کرتے ہو'' -

اپنے اقربا سے ہر شخص کو کم و بیش محبت ہوتی ہے ، پھر رسول اللہ جیسے دردمند انسان کو ، جس کی آنکھیں بسا اوقات اغیار کی مصیبت کا حال سن کر اشکبار ہو جاتی تھیں ، اپنے اعزہ سے کیسی کچھ الفت نہ ہوگی اور اس نازک موقع پر عزیزوں کی بے وفائی آپ کے رحیم و شفیق دل کے لیے کیسی صبر آزما ثابت ہوتی ہوگی - تلوار کے زخم میں درد بہرحال ہوتا ہے لیکن جب زخم پہنچانے کے لیے کسی دوست کا ہاتھ اٹھا ہو تو درد کی ہر ٹیس میں وہ کیفیت ہوتی ہے کہ انسان بعض دفعہ موت کو اس پر ترجیح دیتا ہے - ابولہب آپ کا چچا تھا—وہی چچا جس نے آپ کی ولادت پر اپنی لونڈی ثوبیہ کو بطور اظہار خوشی آزاد کر دیا تھا - مگر آج آپ کو اس درد ناک حقیقت سے سامنا تھا کہ آپ کا چچا آپ کا بدترین دشمن ہو رہا تھا اور چچی کا یہ حال تھا کہ جنگل سے کانٹے سمیٹ کر لاتی اور جن راہوں سے بھتیجا گذرتا وہاں بکھیر دیتی ، کہ منزل حق کے اس رہ نورد کے لیے یہی فرش موزوں

تھا - یہ آبلہ پا ، جس کی نگاہیں برابر اپنے منتہائے مقصود پر جمی ہوئی تھیں ، شکوہ و شکایت کے بغیر اپنے پاؤں سے بھی کانٹے نکالتا اور رستے میں سے بھی دور کر دیتا تھا تاکہ دوسرے راہ گیروں کو تکلیف نہ ہو -

اعدائے دین نے آپ کو ''محمد'' کے بجائے ''مذمم'' کہا (نعوذباللہ) ، تو آپ نے اس پر عجیب نکتہ آموز تنقید فرمائی کہ ''اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو کیونکر مجھ سے پھیرتا ہے ! وہ مذمم کو گالیاں دیتے اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمد ہوں''[1] -

جس شخص کا ایمان آسے عرش استقامت کے اس بلند کنگرے پر پہنچا چکا ہو ، آسے زر ، زن اور زور کی تحریصات کیا لبھا سکتی تھیں - لیکن قریش اپنے زعم میں کچھ اور ہی سمجھے ہوئے تھے - انھوں نے عنقا کے لیے بھی وہی دام بچھایا جس میں کرگس اور زاغ و زغن اسیر ہوتے ہیں - عجیب مؤثر نظارہ تھا جب قریش کا معزز سفیر ، عتبہ ابن ربیعہ ، شہنشاہ کونین کو جس کے قدموں پر سارے جہان کی دولتیں نثار تھیں ، ایک حقیر رشوت سے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا - آپ اس کی پوری شرائط کو خاموشی سے سنتے رہے ، کیونکہ آپ کبھی کسی کی بات قطع نہ کرتے تھے - پھر اس سے پوچھا ''یا ابا الولید! تیرا کلام تمام ہؤا ؟'' آس نے کہا ''ہاں یا محمد''- آپ نے فرمایا : ''اب میری بات سن - بسم اللہ الرحمن الرحیم - حٰم - تنزیل من الرحمٰن الرحیم - کتاب فصّلت آیاتہ قرآناً عربیاً لقوم

---

۱ - ''سیرت'' شبلی -

یعلمون - بشیراً و نذیراً فاعرض اکثرھم فھم لایسمعون - الخ
عتبہ کی زبان پر مہر سکوت لگ گئی ، عالم محویت میں
کلام پاک کو سنتا رہا اور پھر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا -

مجبور ہو کر قریش نے آخر ابوطالب سے شکایت کی -
ابو طالب سے قدرۃً آپ کو بہت محبت تھی اور آپ کے
زمانۂ طفولیت میں جب ابوطالب نے شام کا قصد کیا تھا تو چچا
کی جدائی کے خیال سے آپ کا دل بھر آیا تھا اور آپ نے ان سے
لپٹ کر ساتھ چلنے کی درخواست کی تھی - چچا کی جدائی کا
خیال آج بھی آپ کی آنکھوں کو نمناک کرنے کے لیے موجود
تھا مگر اس خیال کے ساتھ ایک اور چیز تھی جس نے
آپ سے وہ الفاظ کہلوائے جو دنیا کی تاریخ استقامت و استقلال
کا خلاصہ ہیں : "اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور
بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں ، اور چاہیں کہ میں
اس کام کو چھوڑ دوں ، تب بھی خدا گواہ ہے کہ میں اسے
نہ چھوڑوں گا ، تا آنکہ اللہ اس کو پورا نہ کر دے یا میں
اس کوشش میں فنا نہ ہو جاؤں" -

مستہزئین کی ایک پوری جماعت آپ کے ساتھ لگی پھرتی تھی
جو آپ پر مجنون ، شاعر ، ساحر ، عیار ، کے آوازے کستی اور
طرح طرح کی دل آزار پھبتیاں کہتی تھی - جو شخص کسی کی
بات قطع کرنا بھی خلاف اخلاق سمجھتا تھا ، اس کے ساتھ یہ
سلوک ہورہا تھا کہ وہی جن کی بھلائی کی خاطر وہ نصیحت
کرتا تھا اس کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے لیے شور مچاتے
اور اسے گالیاں دیتے تھے - ان بیباکیوں نے بڑھتے بڑھتے آخر
نہایت مذموم اور قبیح صورت اختیار کی - ایک روز جب آپ

کعبے میں مصروف نماز تھے ، عقبہ بن ابی معیط نے آکر گردن مبارک میں ایک کپڑا ڈال دیا اور بڑی سختی سے حضور کا گلا گھونٹنا شروع کیا ، لیکن آپ بارگاہ رب العلٰی میں بدستور اطمینان کے ساتھ سجدہ ریز رہے اور سکون خاطر برہم نہ ہو سکا ۔ اتفاقاً صدیق اکبرؓ اُدھر آ نکلے ، انھوں نے عقبہ کو دھکیل کر ہٹا دیا اور کفار کے مجمع سے قرآن مجید کے ان الفاظ میں خطاب کیا [1] :-

انقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ وقد جاءکم بالبینات° "کیا تم ایک (حق پرست) انسان کو محض اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ خدا کو اپنا پروردگار کہتا ہے اور تمھارے پاس اپنی دلائل بیّنہ لایا ہے؟"

یہ تو جسمانی تکالیف کی کیفیت تھی مگر آپ کو ہر قسم کی روحانی اذیت پہنچانے میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا تھا ۔ آنحضرت پر کئی خانگی صدمات گزرے تھے ۔ آپ کے صاحبزادے طفولیت ہی میں انتقال کر گئے تھے لیکن آپ کا شیوۂ تسلیم زبان پر حرف شکایت نہ لایا تھا ۔ قریش کی بے راہ رو قساوت انسانی جذبات کے آبگینے کو اس نازک مقام پر ٹھیس پہنچانے سے بھی باز نہ رہتی تھی ۔ وہ ان حوادث پر آپ کا ٹھٹھا اڑاتے

---

۱ - صحیح بخاری عن ابن عمرو بن العاص ۔

اور آپ کو ابتر (مقطوع النسل) ہونے کا طعنہ دیتے تھے - مگر خدا نے اپنے وفا شعار بندے کے دل کو انّا اعطینٰک الکوثر اور ان شانئک ہوالابتر کی الہامی تسلی دے کر رضا و توکل سے لبریز کردیا - گھر کے دروازے پر عفونتیں پھینک دی جاتی تھیں تاکہ جمعیت خاطر میں خلل ہو، مگر ظلم کرنے والے مظلوم سے زیادہ طاقتور نہ تھے، جس کا حلم و تحمل اس تمام سامان عذاب و عقوبت کو شکست دینے پر قادر تھا -

لَیسَ الشَّدید باالصرعة اِنما الشدید من یَّملکُ نفسہ عِندالغضَب (صحیحین از مشکوٰۃ صفحہ ۳۶۹)	پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے - پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قدرت رکھتا ہو -

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ پر خاک ڈال دی - آپ اسی حالت میں گھر تشریف لائے - ابن ہشام کا بیان ہے کہ آپ کی ایک صاحبزادی نے مٹی پونچھ دی اور آپ کا سر دھلادیا - لڑکیوں کا دل یو بھی نرم ہوتا ہے - آپ کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگیں - آنحضرت دشمنوں کی دراز دستیاں پیغمبرانہ صبر و سکون سے برداشت کرسکتے تھے لیکن آپ جیسے شفیق باپ کے لیے بیٹی کی یہ قلبی تکلیف یقیناً بہت زیادہ باعث کرب تھی - پھر بھی آپ نے فرمایا کہ "بیٹی، مت رو، بے شک اللہ تیرے باپ کا محافظ ہے -"

"شعب ابی طالب" کے تین سال بھی اسی حیثیت سے آپ کے انتہائی صبر و ثبات کا امتحان تھے - آفات و مصائب کا

اپنے سر پر لینا آنحضرت کے لیے آسان تھا، لیکن اس میں دوسروں کی شرکت کا منظر آپ کے لیے بلا شبہ نہایت عقوبت انگیز ہوگا - گھاٹی کے پاس سے جو لوگ گزرتے تھے انھیں بنی ہاشم کے فاقہ کش بچوں کے رونے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی[1] - ان جگرخراش صداؤں سے حضور کے قلب مجروح کی جو کیفیت ہوتی ہوگی، اس کو وہی مالک الملک جانتا ہے جس نے انسان کا دل بنایا اور اس میں درد کی تڑپ پیدا کی -

ہدایت کے اسرار سمجھنے میں قریش بے شک سست تھے لیکن رموز ضلالت کے فہم و ادراک کے لیے ان کے ذہن کی مناسبت دنیا کی تاریخ ستم گاری میں عدیم المثال ہے - خود آنحضرت کی ذات اقدس پر جفائیں توڑنے میں بھی انھیں خاص لذت ملتی تھی لیکن وہ اس حقیقت کو خوب سمجھے ہوئے تھے کہ آنحضرت جیسے رحیم المزاج اور رقیق القلب انسان کے دل پر سب سے گہرا چرکا اس وقت لگے گا جب آپ کے متبعین مخلصین تختۂ مشق ستم بنائے جائیں گے - چنانچہ صرف ایک مسلمان گھرانے کی داستان مظلومی ہمارے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے اور یاسر، عمّار اور سمیّہ (ان کی ارواح پاک پر ہزار ہزار رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں) ایسے نام ہیں جنھیں لکھتے وقت قلم ہاتھوں میں لرزتا ہے - مگر ان لوگوں کی نظریں اپنے ہادی کے نقش قدم پر جمی ہوئی تھیں اور یہ آن صابرین میں سے تھے جن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے -

---

۱ - زاد المعاد، ج ۱، صفحہ ۲۹۹ -

یہ آنحضرت ہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ غزوۂ احد کے بعد جب خبیب بن عدی اور زید بن مثنہ رضی اللہ عنہما کو قریش نے فریب سے گرفتار کرلیا اور چند روز تک بھوک پیاس کے عذاب میں مبتلا رکھا تو ان کا پائے ثبات ایک کوہ وقار کی طرح غیرمتزلزل رہا - لیکن ان بزرگوں کے لیے دارورسن کی ایک سخت تر آزمائش ابھی باقی تھی - اُن کے خون کے اُبلتے ہوئے فواروں ، ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں ، اُن کی اکھڑی ہوئی سانس نے ابھی زبان حال سے ''ھواللہ احد'' کے نعرے بلند نہ کیے تھے - آخر وہ دن بھی آیا کہ انھیں صلیب کے سامنے کھڑا ہونا پڑا لیکن آج بھی اس پنج روزفانی کی نافرجام قوتیں ، اپنی تمام ترغیبات و ترہیبات کے ساتھ ، اُن کی آنکھوں کو ہیچ نظر آئیں -

منصوروار گر ببرندت بہ پائے دار
مردانہ پاے دار ، جہاں پائدار نیست

انھیں اختیار دیا گیا کہ کفر اور موت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں ، مگر اب بھی ان کے مقدس رہنما کا اُسوۂ حسنہ دست غیب کی طرح اُسی منزل کی طرف اشارہ کر رہا تھا ، جہاں پہنچنے کے لیے موت کی ہیبت افزا سرحد سے گزرنا ان کے واسطے ضروری ہوگیا تھا -

فاقض ما انت قاض انما	تو جو کچھ کرنے والا ہے
تقضی ھٰذہ الحیاۃ الدنیا انا	کر گزر ! تو دنیا کی اسی
آمنا بربنا لیغفرلنا خطایانا○	زندگی پر حکم چلا سکتا ہے
	(کہ ہم کو عذاب دے یا

بہت کرے تو جان سے مار
ڈالے) اور بس ، ہم اپنے
پروردگار پر ایمان لا چکے
ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہوں
کو معاف کرے ۔

ظالموں نے انھیں سولی پر لٹکا دیا اور نیزہ برداروں سے کہا کہ نیزوں سے ان کے جسم کے ایک ایک حصے کو چھید ڈالیں ، ایک ایک عضو پر کچوکے لگائیں[1] ۔ لیکن اسلام کے یہ بطل جلیل جوشِ فدویتِ حق کی ان بالائے فلک بلندیوں پر فائز ہو چکے تھے کہ اگر کفر کے نیزوں کی انی ان کے دل و جگر اور رگ و پوست کو چیر کر مغز استخواں تک بھی پہنچ جاتی تو ان کی لذت آزار پروانہ وار ''العطش ! العطش'' ! پکارتی ہوئی پائی جاتی :

تنم بسوخت ، دلم سوخت ، استخوانم سوخت
تمام سوختم و ذوق سوختن باقیست !

---

۱ ۔ بخاری عن عبداللہ بن عیاض ۔

قریش کے اباواستکبار کا منظر ابھی آنکھوں کے سامنے تھا کہ حکیم مطلق کے دست قدرت نے تلخابۂ اجل کے تلخ ترین قطرے پیغمبر کے جام ابتلاوشکیب میں ملا دیے - ابو طالب اور خدیجۃ الکبریٰ نے، تین دن کے فرق کے ساتھ، حضور سے مفارقت جاودانی اختیار کی - مگر اس سے کیا ہوتا تھا، جب آپ کی عزیمت اور استقامت اسی پیغمبرانہ شان سے آپ کے ساتھ تھی - اس خیال سے کہ شاید مکے سے باہر تبلیغ ہدایت میں زیادہ کامیابی ہو، آپ خدا کا آخری پیغام لے کر طائف پہنچے - مگر اس حق ناشناس بستی نے پتھر برسا کر اپنے مقدس مہمان کو اس قدر مجروح کردیا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا - لیکن ان صبرفرسا مصائب کے باوجود اس پیکر وفا کی زبان سے اگر کچھ نکلا تو یہ لفظ تھے :

ان لم یکن علی غضب فلا أبالی ولکن عافیك اوسع لی اعوذ بنور وجهك الذی اشرقت له الظلمٰت○[1]

الٰہی اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو میں بے فکر ہوں، کیوں کہ تیرا دامانِ رحمت میرے لیے زیادہ وسیع ہے - میں تیری ذات کے نور میں پناہ لیتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں منور ہو جاتی ہیں -

---

۱ - تاریخ ابن الاثیر، جلد ۲، صفحہ ۷ -

شان نبوت کی یہ فتح الفتوح ، یہ عظیم الشان کامرانی ، قریش کی ظاہر بیں آنکھوں کو بجز ناکامی کے اور کسی رنگ میں نظر نہ آسکتی تھی - اُن کی ستم رانی کے حوصلے اور بڑھ گئے اور انھوں نے قطعی اور آخری طور پر اسلام کی بیخ کنی کا فیصلہ کرلیا - آخر صورت حالات کو دیکھ کر آنحضرت نے مومنین کی مختصر جماعت کو مدینے کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا -

واقعۂ ہجرت میں جو عظیم الشان درس حیات اور قابل تقلید اسوۂ تبلیغ ہدایت پنہاں تھا ، اس کی حقیقت تک مغربی مورخین اپنے قصور فہم کی وجہ سے نہیں پہنچ سکے - چنانچہ انگریزی میں جناب خیرالانام کی اس سنت کے لیے جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ "فرار" کا ہم معنی ہے - فرار کی تحریک خوف و ہراس کے جذبے سے ہوتی ہے ، لیکن آنحضرت کی حیات طیبہ پر ایک سرسری سی نظر ڈال لینے کے بعد اس قسم کے خوف و ہراس کو آپ کی ذات گرامی سے منسوب کرنا عقلاً محال ہوجاتا ہے - عقبہ بن ابی معیط کی گلوفشار گرفت آپ کے سکون خاطر کو اس حد تک بھی برہم نہ کرسکی تھی کہ آپ کی جبین سجود میں اضطراب کی ایک شکن پڑتی - غار ثور میں جب خون کے پیاسے دشمن سر پر آہی پہنچے تھے ، آپ کی استقامت نے آپ کے یار غار کو "لاتحزن ان اللہ معنا" کا پیغام دیا تھا - دعثور بن الحارث کی تلوار جب آپ کی شہ رگ کے قریب آ پہنچی تھی تو آپ کی شان عبداللہی نے خدا کو اپنی شہ رگ سے قریب تر پایا تھا - بدر اور حنین اور احد کی زہرہ گداز ساعتوں میں اعدا کے طاقتور ہاتھ آپ کے رشتۂ توکل کو قطع نہ کرسکے تھے ، کیونکہ

اس حبل المتین کا دوسرا سرا خود قادرمطلق نے تھام رکھا تھا - پھر ایسے "اشجع الناس[1]" ، ایسے مجسمۂ صبر و ثبات ، نے اپنی مساعئ حقہ کا میدان بدل کر دنیا کو جو غیر فانی سبق دیا ، اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے یورپ کی عناد کیش منطق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتی ہے کہ آنحضرت معاذاللہ اپنی جان کے خوف سے مدینے کو بھاگ نکلے - دار الندوہ میں آنحضرت کے قتل کی سازش ضرور کی گئی تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ مکے کو خیرباد کہہ کر آپ نے اپنی جان بچالی ، مگر اس سنت نبوی کی حقیقت صرف اسی قدر نہیں - اس مسئلے کی نسبت ابھی بہت کچھ اور بھی کہنے کی گنجائش ہے -

وہ کیا محبوب مقصد تھا جس کی خاطر آپ تیرہ برس تک تمام مکے بلکہ تمام عرب کے مقابلے میں سینہ سپر رہے ؟ یہ مقصدعزیز اس ارشادایزدی کے سوا کچھ نہ تھا :

واما نرینک بعض الذی نعدھم اونتوفینك فانما علیک البلاغ و علینا الحساب○	ان کافروں سے جو وعدے ہم نے کیے ہیں آن میں سے بعض کے پورا ہونے کا منظر خواہ ہم تمہیں دکھا دیں اور خواہ وفات دے دیں ، تمھارا کام (ہمارے پیغام کا) پہنچا دینا اور ہمارا کام حساب لینا ھے -

---

۱ - خادم بارگاہ نبوی حضرت انس نے آنحضرت کی شجاعت کے بیان میں حضور کو یہ لقب دیا تھا -

وعلینا الحساب ! ہاں یہ ابدی حقیقت اپنی پوری الہامی تجلیوں کے ساتھ شب و روز پیغمبر کے سامنے تھی ۔ اُس آخری حج کے موقع پر جب حضور اپنی اُمت کے مختلف اطراف و اکناف سے آئے ہوئے افراد سے رخصت ہوئے ، آپ نے لوگوں سے کہا کہ ''ایک دن تم سے میرے متعلق بھی پوچھا جائے گا ، اُس وقت تم کیا جواب دو گے''؟ اور جب ہزار ہا مومنین مخلصین کی غلغلہ انداز صداؤں نے تبلیغ نبوی کی ہدایت آموز کامیابی کا اعلان کیا ، تو آپ نے تین بار آسمان کی طرف انگلی اٹھائی ، تین بار لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور تین بار ''اللہم اشہد'' کا کلمۂ طیبہ زبان سے ادا فرمایا[1] ۔ جب حیات عنصری کا پیمانہ لبریز ہوچکا اور رفیق اعلیٰ سے جا ملنے کی ساعت قریب آ گئی ، اس وقت بھی ''فانما علیک البلاغ'' کی نص صریح سرور کائنات کی نظروں کے سامنے تھی اور آپ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے : ''میں تبلیغ کا حق ادا کر چکا ، اے خدا ، تو اس کا گواہ رہ[2] ۔'' '' یتلوا علیہم آیاتہ ویزکیہم'' کی صداقت عظمیٰ قدم قدم پر آپ کی آنکھوں کے سامنے چمکتی تھی اور منزل حیات میں آپ کا اُٹھنا ، بیٹھنا ، ٹھہرنا ، چلنا ، سب اسی غایت کے حصول کے لیے تھا ۔ کامل تیرہ برس تک خونخوار دشمنوں کی مسلسل درازدستیوں ، بے محابا گستاخیوں کو آپ نے ایک فوق الکرامت استقامت سے شکست دی اور عدوان و طغیان کی اس مسموم فضا میں آپ کی ایک ایک سانس آپ کے خونچکاں دل سے ''واصبر علی ما اصابک ِ ان ذالک من عزم الامور'' کا

---

۱ ۔ صحیح مسلم و ابو داؤد ۔

۲ ۔ موطاء امام مالک ۔

معجز نما جواب لاتی رہی ، لیکن جب قریش نے ہدایت کی تمام راہیں اپنے لیے بند کر لیں ، ''ختم اللہ علیٰ قلوبھم و علیٰ ابصارھم غشاوۃ'' کی عملی اور واقعی تصویر بن گئے - چنانچہ قبیلۂ دوس کے سردار طفیل بن عمرو نے کانوں کو روئی سے بند کر کے کہ کہیں کوئی کلمۂ ایمان اس راہ سے دل تک نہ جا پہنچے ، کفار کی ذہنی کیفیت کا نقشہ کھینچ دیا - خود ابوجہل نے جناب رسالت مآب سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے تیری راست بیانی پر شبہ نہیں ، لیکن جو پیغام تو لایا ہے میں اسے نہیں مانتا''[1]

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

پھر یہی نہیں بلکہ آخری چارۂ کار کے طور پر یہ لوگ حضور کے قتل کے درپے ہوئے تو اس وقت محض اس خیال سے کہ مبادا وہ مقدس فرض بھی اس حیات مستعار کے خاتمے کے ساتھ نا تمام رہ جائے جس کی تکمیل کارفرمائے ازل نے مجھ سے وابستہ کر دی ہے ، آپ نے اپنے مولد و منشا ، اپنے اجداد کے قدیم شہر سے جدائی اختیار کی ، کیونکہ آپ کی آنکھیں اس مستحکم اور پائدار حقیقت کو دیکھ رہی تھیں : ''ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ'' ، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اہل ایمان جو جنت کی آرزو رکھتے ہیں ، اس بات کے مجاز نہیں کہ خوشنودی خدا کے سوا کسی اور مقصد کے حصول کے لیے اپنی جان یا مال کو معرض خطر میں مبتلا کریں ، کیونکہ ان کی جان و مال کا مالک اللہ اور صرف اللہ ہے - ہجرت کر کے آپ نے محمد ابن عبداللہ کی نہیں

۱ - شفاء عیاض -

بلکہ محمد رسول اللہ کی جان بچائی تھی (علیہ الف الف تحیات)
اور اس پیغمبرانہ عمل سے آپ نے دنیا کو بتا دیا کہ صادقین
کی زندگی ''فتمنوا الموت'' کے امر اور ''لاتلقوا باید یکم الی
التہلکۃ'' کی نہی کا مجموعہ ہے - قریش نے قبول رشدو ہدایت
سے قطعی انکار کر دیا تھا ، اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے لیے عمر عزیز کی گزرتی ہوئی ساعتوں کو
بے کار کھونا اور بار بار نیش عقرب کا مزا چکھنا بداہتہً
خلاف مصلحت تھا - چنانچہ اسی خیال نے جو آپ کو طائف لے
گیا تھا ، اب آپ کو مدینہ پہنچا دیا اور دنیا نے بالآخر یہ
دیکھ لیا کہ حضور کی یہ مقدس سنت کس قدر عظیم برکات و
حسنات کا سر چشمہ ثابت ہوئی - آنحضرت کو محض اسلام کے
مقاصد عالیہ کی تکمیل منظور تھی - یوروپ کے اس نوخیز
تمدن کی ناشناس تحسین آپ کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہیں
کرسکتی جس کے رنگا رنگ معیار ہائے اخلاق ہمیشہ دنیا کے
حوادث و تغیرات کی موج فنا پر رقص کرتے رہے ہیں اور
کرتے رہیں گے -

*

اُس جاہلیت نے جو کئی صدیاں گزریں عرب قدیم کے آغوش میں پرورش پا رہی تھی، اب پھر یورپ کی سرزمین سے سر نکالا ہے اور اس کے علم‌بردار حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض و عداوت کا اظہار کر کے اپنے قدیم عربی پیشرووں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں - ''باؤفو میٹ'' اور ''بافوم'' کی نیرنگ نواز افسانہ‌طرازیوں کا وقت تو گزر چکا کہ ارباب جاہلیت جدیدہ کسی زمانے میں حضور رحمت‌دوجہاں کو اسی نام سے یاد کر کے، حضور کو معاذاللہ ایک خون آشام اور انسان خور دیوتا قرار دیتے تھے - لیکن اب متعصبین‌فرنگ کے اعتراضات حکمت و فلسفہ کا طرۂ فضیلت لگا کر ایک مضحکہ انگیز ادائے ثقاہت کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں - ہم سے کہا جاتا ہے کہ جنگ ایک وحشیانہ فعل ہے جس کو کوئی روحانی تعلیم جائز نہیں قرار دے سکتی اور اسلام کی اشاعت تمام‌تر شمشیر و خنجر کی شرمندۂ‌احسان ہے - ان اعتراضات کی تردید بجائے خود اس قدر اہم اور اشاعت اسلام کا اسوۂ نبوت بہ‌حیثیت جناب رسالت‌مآب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہونے کے، اس قدر عظیم‌الشان ہے کہ میں اس کی تشریح و توضیح کے لیے یہاں زیادہ گنجایش نکالوں گا -

زندگی ایک رزم گاہ ہے جس کی تمام ہنگامہ آرائیاں ایک اور صرف ایک مقصد کے حصول کے لیے جاری ہیں اور یہ مقصد وحید انسان کی تطہیر اور خدا کے نام کی تقدیس کے

سوا کچھ نہیں ۔ اس عالم وجود میں بدی نے ہمیشہ نیکی کو مٹانے کی کوشش کی ہے اور نیکی نے ہمیشہ بدی کو نابود کرنا چاہا ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

جو لوگ جنگ کو بے کار اور بے سود خیال کرتے ہیں انھیں خود اپنی ذات پر غور کرنا چاہیے کہ کیا اُن کی روح خیر و شر کی دو متضاد قوتوں کے تعارض و تصادم کا منظر پیش نہیں کرتی ؟ یہی تعارض جب وسیع تر صورت اختیار کرتا ہے تو افراد سے گزر کر اقوام و ملل تک جا پہنچتا ہے اور یہ کشمکش وہاں بھی جاری رہتی ہے ۔

اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی

بلا شبہ جنگ بذات خود کوئی ایسی خوش آئند چیز نہیں کہ انسان اس کا آرزومند ہو کیونکہ یہ بہر حال اس المناک حقیقت کی یاد تازہ کرتی ہے کہ انسان اگر فرشتہ ہے تو شیطان بھی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ درشت صداقت کہ دنیا میں بدی موجود ہے جو مادی قوتوں کو تصرف میں لا کر نیکی کو مٹادینے پر تلی ہوئی ہے ، پکار پکار کر ہم سے کہہ رہی ہے کہ اگر تم نے نیکی کی مدافعت اور محافظت نہ کی تو اس کا نام دنیا سے اُٹھ جائے گا ۔ رحم و کرم اور محبت و شفقت نہایت مستحسن جذبات ہیں لیکن ہر جذبے کے استعمال کا کوئی خاص موقع اور محل ہوتا ہے اور اسی موقع و محل کی اضافت سے اس جذبے کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا

ہے - مثلاً اگر کوئی شخص ازراہ غایت محبت سانپوں اور بچھوؤں کو پالنے لگے اور اُن کی افزائش نسل کا باعث ہو تو اُس کا یہ فعل دنیا کے کسی صحیح الدماغ اور سلیم العقل انسان کے نزدیک سزاوارستائش نہ ہوگا - مسلمان خدا کی عطا کی ہوئی تمام قوتوں سے مستفید ہوتا ہے لیکن اُن کے اخلاق مواقع استعمال سے بے نیاز ہوکر کورانہ طور پر اُن سے کام نہیں لیتا - اُس کا رحم و محبت صرف نیکی کے لیے اور اُس کا غیظ و غضب محض بدی کے لیے مخصوص ہے - لیکن اس باب میں شاید استدلال کی زیادہ ضرورت نہیں کیونکہ خدا کی عنایت سے انسان کو جنگ کے جواز کے لیے کبھی فلسفۂ فرنگ کی تائید کا محتاج نہیں ہونا پڑا اور دنیا کے واقعات یوروپ کے قیاسی اجتہادات کی مدد کے بغیر ظہور میں آتے رہے ہیں - جنگ ہمیشہ سے تھی اور آج تک ہے اور دنیا کی تمام سابقہ و موجودہ حکومتوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس نے بعض نہایت سنگین جرائم کے لیے قتل کی سزا مقرر کرکے یہ ثابت نہ کردیا ہو کہ امن و صلح کے قیام کے لیے طاقت کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے - پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ حیات انسانی کے ایسے اہم شعبے کے متعلق شارع اسلام علیہ الصلواۃ و السلام کا اُسوۂ حسنہ خاموش ہوتا - آنحضرت نے جہاں ہر موقع پر تا بحد امکان معرکۂ حرب وقتال سے احتراز کیا ہے، وہاں اٹل اور ناگزیر ضرورت پر کبھی اپنے فطری رحم و رفق اور حلم و بردباری کو غالب نہیں آنے دیا، کیونکہ آپ کے تمام محاربات ذاتی اغراض کی آلائش سے پاک اور خالصتاً فی سبیل اللہ تھے -

باایں ہمہ حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اشرار کی تباہی کے بجائے ہمیشہ اُن کی اصلاح کے لیے جد و جہد کی۔ طائف سے انتہائی مظلومی کی حالت میں مراجعت کرتے وقت بھی آپ نے یہ نکتہ آموز حقیقت ارشاد فرمائی:

> ''میں ان لوگوں کی ہلاکت کے لیے کیوں دعا کروں؟ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو ان کی آئندہ نسلیں ضرور خدائے واحد کی پرستش کریں گی۔''[1]

مسلمانوں کے لیے یہ ارشاد نبوی بہ‌غایت نتیجہ خیز اور بصیرت افروز ہے اور آنحضرت کے غزوات بھی اسی حقیقت کی توضیح کرتے ہیں کہ کفار کی ہلاکت سے اُن کا ایمان لانا اسلام کو زیادہ عزیز ہے۔ اس کے متعلق آگے چل کر میں نظائر و امثال پیش کروں گا، لیکن یہاں ایک جرمن نو مسلم ڈاکٹر ہیوگومارکس کا قول نقل کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک آنحضرت کے جہاد بالسیف کے صحیح اسلامی مفہوم کی نہایت عمدہ تشریح کرتا ہے۔

> ''آپ ہاتھ میں تلوار لیتے ہیں اور دشمنوں سے اُس وقت تک جنگ کرتے ہیں جب تک وہ حق و صداقت کے لیے سد راہ ثابت ہوں لیکن جوں ہی فتح حاصل ہوتی ہے اور دشمن ہتھیار ڈال دیتا ہے، آپ کے طرز عمل میں تغیر واقع ہوتا ہے۔

۱۔ صحیح مسلم عن عائشہ رضی اللہ عنہا

شکست خوردہ اور کمزور حریف اب دشمن نہیں
رہتا ، اُس کا خیر مقدم عفوو در گزر سے کیا جاتا
ہے - نہیں ، بلکہ فاتح خود مفتوح کی دوستی کا
خواہاں ہوتا ہے" -

فتح مکہ کے بعد جب اسلام کا دنیوی اقتدار اور کفر
کی طاقت کا قطعی زوال تمام عرب کو صاف نظر آنے لگا ، اُس
وقت عکرمہ بن ابو جہل جیسا زبردست دشمن اسلام جو بارہا
مسلمانوں کے خلاف معرکہ آرا ہؤا تھا ، جس نے فتح مکہ
سے کچھ ہی عرصہ قبل بنو خزاعہ کو جو مسلمانوں کے حلیف
تھے، تباہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا اور اب اپنی غلط کاریوں
کی پشیمانی اور خوف سے دشت غربت میں مارا مارا پھر رہا تھا ،
حضور کی رحمت کے بھروسے پر آپ کی خدمت میں حاضر کیا
گیا - آپ اس کو دیکھ کر فوراً اُٹھے اور نہایت تپاک سے اُس
کی طرف بڑھے - اپنے شدید ترین اور شاید سب سے زیادہ خوفناک
دشمن کے بیٹے کے لیے کلمۂ ملامت کے بجائے خیر مقدم کے یہ
الفاظ آپ کی زبان پر تھے : "اے مسافر سوار ! تمھارا آنا
مبارک ہو" -

*

ہجرت مدینہ کے بعد قرآن حکیم نے مسلمانوں کو حسب ذیل الفاظ میں غزا و جہاد کی اجازت دی اور جنگ کے اسلامی نقطۂ نظر کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دیا :

أُذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا و ان الله علىٰ نصرهم لقدير الذين اخرجوا من ديارهم بغير حق الا ان يقولوا ربنا الله ولولا دفعَ الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع و بيع وصلوا ت و مساجد يذكر فيها اسم الله كثيراً ؕ

مسلمان جن سے (بلا سبب) جنگ کی جاتی ہے ، اب اُن کو بھی جنگ کی اجازت دی گئی کہ وہ مظلوم ہیں اور خدا اُن کی مدد پر قادر ہے ، وہ جو ناحق گھروں سے نکال دیے گئے ، سوا اس کے اُن کا کوئی اور قصور نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے ، اگر دنیا میں ایک قوم کو دوسری قوم سے بچایا نہ جائے تو بہت سی خانقاہیں ، کلیسا ، عبادت گاہیں ، مسجدیں جن

میں اکثر خدا کا نام لیا جاتا

ہے برباد کر دی جائیں -

(سیرت شبلی)

قرآن مجید کا محولہ بالا اقتباس صاف بتا رہا ہے کہ جہاد بالسیف کا یہ اذن عام اس وقت ہوا جب مسلمان ایک عرصۂ دراز کی مظلومی و ستم کشی کے بعد بھی تسلیم و رضا کی زندہ تصویر بنے ہوئے، اپنے وطن اور گھر بار کو چھوڑ کر، تین سو میل دور کے ایک شہر میں جابسے تھے مگر کفار قریش نے، جن کے جذبۂ بغض و عداوت کی پیاس ابھی نہیں بجھی تھی، اپنی گرگ وار خون آشامی کے ساتھ یہاں بھی ان کا پیچھا کیا تھا - جنگ کی ابتدا ہمیشہ قریش کی طرف سے ہوئی - پہلا معرکہ غزوۂ بدر تھا، اس میں بھی سبقت قریش نے کی - چنانچہ ہجرت کے دوسرے ہی سال ایک قریشی رئیس کرز بن جابر الفہری انتہائے بے باکی سے مدینہ والوں کے مویشی لوٹ کر لے گیا - اس کے علاوہ مدینہ کی یہودی جماعت سے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی گئیں، مسلمانوں کو تباہی و بربادی کی دھمکیاں دی گئیں اور بالآخر ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ابوجہل نے وسیع پیمانے پر فوجی تیاریاں شروع کردیں - اسی طرح سویق اور احد کے غزوات میں بھی جارحانہ اقدام کفار ہی کی طرف سے ہوا - اس صورت حالات میں اگر آنحضرت کی پیغمبرانہ الوالعزمی دفاعی تدابیر اختیار نہ کرتی تو مومنین کے قلیل گروہ کا نابود ہو جانا صاف نظر آرہا تھا، اور اس کے ساتھ ہی آپ کا عظیم الشان مقصد حیات بھی شاید تباہ ہو جاتا جس کی تکمیل کا احساس آپ

کو اپنی زندگی کی ایک ایک سانس کے ساتھ رہتا تھا۔ چنانچہ غزوۂ بدر سے پہلے آپ نے خدا سے بہ خضوع و خشوع دعا کی کہ اگر تونے آج اپنے ان مجاہدین کی حفاظت نہ کی تو دنیا میں تیری توحید کی منادی کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ عام مورخین نے شاید کبھی اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ مسلمانوں کی سیزدہ صد سالہ رزمیہ روایات کیوں اس کثرت کے ساتھ اس قسم کے دل آرا مناظر پیش کرتی ہیں کہ عین اس وقت جب ہنگامۂ کارزار گرم ہے اور دونوں طرف کے سورما داد تہور دے رہے ہیں، عساکر اسلام کا سالار، نشۂ شجاعت کی سرشاری میں فخر و غرور کا اظہار کرنے کے بجائے، اپنی نیاز کیش پیشانی کو خاک تذلل پر رکھے ہوئے، فتح و نصرت کے لیے خدائے قدیر سے تائید و اعانت کی التجا کر رہا ہے۔ حقیقت میں یہ سب اس عظیم روحانی قوت کے کرشمے ہیں جس کا سراغ شارع اسلام علیہ الصلوۃ والسلام کی جبین اقدس کے سجدوں کی تڑپ بدر، اُحد، خندق، خیبر اور تبوک کے میدانوں میں چھوڑ گئی تھی۔ خود ہندوستان کے دو بہت بڑے تاریخی معرکوں یعنی حملۂ سومنات اور پانی پت کی پہلی لڑائی میں قشون قاہرۂ اسلام کے قائد اسوۂ نبوی کا اتباع کرکے اہل نظر کے لیے فکر و بصیرت کا سامان بہم پہنچا چکے ہیں۔

خدا کے دست قدرت کی کارفرمائیاں بعض دفعہ ایسے ان دیکھے اور ان بوجھے طریقوں پر ظاہر ہوتی ہیں کہ انسان کو بالعموم ان کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقع پر جو معاہدہ قریش اور آنحضرت کے درمیان ہوا، اسے

متعدد صحابۂ کرام ، یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے مقرب بارگاہ رسالت بھی ، اہل کفر کے غلبے اور سر بلندی سے تعبیر کر رہے تھے ۔ لیکن پردۂ غیب کے پیچھے بساط تقدیر کسی اور قرینے سے بچھائی جا چکی تھی ، اور یہی معاہدہ آخرکار مسلمانوں کے لیے ابراہیم خلیل اللہ کے شہر کے دروازے کھول دینے والا تھا ۔ صلح حدیبیہؓ کو ابھی پورے دو برس بھی نہ گزرے تھے کہ قریش نے شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ، بنو بکر کے ساتھ مل کر ، بنو خزاعہ پر جو مسلمانوں کے حلیف تھے ، حملہ کیا ۔ بنو خزاعہ تاب مقاومت نہ لا کر کعبۂ مکرمہ میں پناہ گزیں ہوئے لیکن بیت الحرام کی حدود مقدسہ کی عظمت بھی ظالموں کی خونریز و خون آلود تلواروں کو نیام میں نہ کرسکی ۔ بنو خزاعہ نے اُن سے ، خود اُن کے خدا کے نام پر ، امان مانگی ۔ مگر اُن سفاکوں کے ہلاکت بار خنجر ، کوندتی ہوئی بجلیوں کی طرح ، بے دریغ اپنا کام کرنے لگے ۔ "الہک ! الہک ! !" کی مظلومانہ التجاؤں کے جواب میں خدا کے گھر کے اندر "لاالہ الیوم" کے فرعونی نعرے بلند ہوئے لیکن ان سرگشتگان ضلالت کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ خدا اُس روز بھی تھا اور دس ہزار قدوسیوں کا لشکر جرار بھیج کر مظلوموں کی داد رسی کرسکتا تھا ۔ بنو خزاعہ میں سے چالیس ستم رسیدہ جان بچا کر دربار رسول میں پہنچے اور انصاف کے طلب گار ہوئے ۔ قریش نے علی رغم شرائط صلح ، اسلام کے ایک دوست دار قبیلے پر قاتلانہ حملہ کر کے گویا مسلمانوں کو دعوت جنگ دی تھی کہ "آؤ اگر ہمت ہے تو مقابلے کے لیے نکلو ۔" رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسلام نے اس تحدّی کو قبول کیا

کہ اعانت حق اور تائید انصاف کا تقاضا بھی یہی تھا - مزید
برآں یہ کیونکر ممکن تھا کہ صادق و امین نبی ایسے حق
معاملے کے متعلق ایک معاہد قبیلے سے ایفائے عہد نہ کرتا -

فتح مکہ کا دن بھی عجیب دن تھا ۔ آج خدا نے اپنے ہاتھ سے پیغمبر کے سر پر سطوت کبریٰ کا تاج رکھ کر آپ کو دینی و دنیوی کامرانی کی اعلیٰ ترین معراج پر فائز کردیا ۔ آسی شہر نے جہاں آپ کو گالیاں دی جاتی تھیں، جہاں اس کے سر پر نجاستیں ڈالی جاتی تھیں، جہاں اس کے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے تھے، ہاں اسی دارالکفر نے جواب دارالاسلام بننے والا تھا، آج اپنے دروازے اس کے لیے کھول دیے تھے ۔ دنیا کہے گی کہ آج ناز و غرور کے اظہار کا دن تھا، آج آس کا سر جوش تفاخر میں ہفت افلاک سے بلند ہوتا تو بجا تھا اور کسی ساز و یراق سے مرصع راہوار کی پشت پر بیٹھے ہوئے اس کی پُرجلال آنکھوں کو قدم قدم پر اپنے دشمنوں کی رسوائی و نگوں ساری کا منظر دیکھنا چاہیے تھا، کیونکہ بظاہر آسی کی حکمت و تدبر، آسی کے ایثار و استقامت نے یہ دن دکھایا تھا کہ آج مکہ کی فضا نعرہ ہائے تکبیر کے غلغلے سے لرز رہی تھی ۔ اسلام کی فوج تا بحد نگاہ ایک طوفان خیز سمندر کی طرح پھیلتی چلی گئی تھی جس کی آبلتی اور ابھرتی ہوئی موجیں ہر طرف سے بہتی اور آمنڈتی آرہی تھیں ۔ ایک ایک سپاہی نشۂ شجاعت میں چور، سینے تانے ہوئے بلدالامین میں داخل ہو رہا تھا اور آفتاب صبح کی نورانی کرنوں میں مجاہدین کی کفر سوز تلواروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی ۔ ہزارہا جاں نثار غلام، جن کے قدموں کی دھمک سے زمین متزلزل ہو رہی تھی، اس وقت پیغمبر کے گرد حلقہ زن

تھے ۔ مگر وہ جو عجز و فروتنی کی زندہ تصویر بنا ہوا اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا تھا ، اُس کا دل فتح و کامرانی کی اس ساعت میں کسی اور جذبے سے سرشار تھا ۔ ایک آزاد شدہ غلام کا بیٹا[1] جسے اسلام کی مساوات نے سر آنکھوں پر جگہ دی تھی ، اس سواری میں اُس کا ردیف تھا اور فرط انکسار سے اُس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اونٹ کے کجاوے کے سامنے کے حصے سے لگا جاتا تھا ۔ اس عبرت آموز منظر کی علت فقط اتنی تھی کہ کوئی فاتح اپنے مفتوح شہر میں داخل نہیں ہو رہا تھا بلکہ خدا کا پیغمبر خدا کے گھر میں حاضر ہو رہا تھا ۔ کعبے کے اندر پہنچ کر بھی حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی شان نیاز دکھائی اور اس عظیم الشان کامیابی کے لیے اپنی عقل و تدبیر یا عزم و استقلال پر ناز کرنے کے بجائے خدائے قادر و توانا کے سامنے نہایت عجز و انکسار سے اپنی پیشانی کو خاک پر رکھ دیا ۔

شاید غیر مسلم مورخین کو حیرت ہو کہ کس نامعلوم قوت کا تصرف قرون وسطی کے خود مختار اور مطلق العنان مسلمان سلاطین کو جادۂ عدل و اتقا سے منحرف نہ ہونے دیتا تھا ۔ مگر ہم مسلمانوں کے لیے جو اپنے پیغمبر کے سوانح حیات سے واقف ہیں اس سوال کا جواب دینا کچھ مشکل نہیں ۔ عجز و نیاز کا جو گرانمایہ سبق رسول نے فتح مکہ میں اور خدا نے حنین کے دن اسلام کو دیا ، اُسے مسلمانوں نے کبھی فراموش نہیں کیا اور تاریخ اسلام کے تقریباً ہر دور میں کوئی نہ کوئی مسلمان تاجدار کسی نہ کسی رنگ میں اپنے ہادیٔ برحق

---

۱ ۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ۔

حضور شہنشاہ کونین علیہ افضل التحیاۃ کی اس سنت حسنہ کے معجزانہ ثبات و قیام کا ثبوت دے چکا ہے ۔ مثال کے لیے میں ایک ایسے اسلامی حکمران کا انتخاب کرتا ہوں جس کی قوم قبول اسلام سے پہلے بجز اپنی وحشت و جہالت کے اور کوئی مایۂ امتیاز نہ رکھتی تھی ۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز دیکھو کہ صدیوں کا فصل زمانی بیچ میں حائل ہونے کے باوجود ، حضور کے اسوۂ مقدسہ کی مقناطیسی کشش نے سلجوقیوں کے ایک ذی جبروت فرماں فرما سے ، ان آخری تاریک ساعتوں میں بھی جب موت کا سایہ اس کے ستارۂ حیات کو گھنا رہا تھا ، وہ الفاظ کہلوائے جن سے زیادہ عبرت انگیز کلمہ دنیا نے شاید کبھی کسی مرنے والے کی زبان سے نہیں سنا ۔ الپ ارسلاں کتنا بڑا سلطان تھا ! اس کی وسیع سلطنت شمال میں ترکستان سے لے کر ایشائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی اور جنوب میں سارا ایران اور سارا عرب اس کے زیرنگیں تھا ۔ اس کے شکوہ و جلال نے شرق و غرب میں خاندان سلجوق کا ڈنکا بجا دیا تھا ۔ آرمینیا میں اس کے اقبال نے تائید ایزدی سے بازنطینی افواج کو شکست دی اور قیصر روم رومانس دیو جانس کو گرفتار کیا ۔ اس معرکے کے بعد الپ ارسلاں دو لاکھ کے لشکر کے ساتھ بجانب ترکستان روانہ ہوا لیکن قضا نے دریائے جیحوں سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی اور یہاں اپنے ہی ایک قیدی کے ہاتھوں شہید ہوا ۔ مگر اس سے پہلے کہ موت اسے ہمیشہ کے لیے سر زمین غیب کو لے جاتی ، اس کی زبان سے یہ یادگار زمانہ کلمات نکلے :

"میں جب کبھی کسی ملک کی طرف لشکر کشی
کے ارادے سے بڑھا ہوں، میں نے بارگاہ کبریا
سے مدد کی التجا ضرور کی ہے - لیکن کل جب میں
ایک پہاڑی پر کھڑا تھا تو میری نظر اپنے
صف بہ صف اور قطار اندر قطار عساکر پر پڑی اور
میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں دنیا بھر کا
فرماں‌روا ہوں اور کوئی طاقت مجھے زیر نہیں
کرسکتی - آج خدا نے اپنے ایک نہایت ہی کمزور
بندے کے ہاتھوں میرے غرور سربلندی کو
توڑ دیا - میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں اور
خدائے پاک سے اپنے اس گنہگارانہ خیال کی معافی
مانگتا ہوں -"

الپ ارسلان آج مرو میں سو رہا ہے اور اس کے مقبرے کا کتابہ ہمیں ان الفاظ میں اسلام کے اس فرزند جلیل کی داستان عبرت سناتا ہے :

سرالپ‌ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں ؟
بہ مرو آ، تا بخاک اندر سرالپ‌ارسلاں بینی !

★

فتح مکہ ایک اور لحاظ سے بھی اسلام بلکہ دنیا کی تاریخ کشورکشائی میں شہرت ابدی کی سزاوار ہے۔ ''لاالہ الیوم'' کی طاغوتی صدائیں اس شہر میں اسلام کی آمد آمد کی نقیب بنی تھیں لیکن خود اسلام نے آ کر سرکشوں کو بھی اپنے دامان رحمت میں چھپا لیا اور شارع اسلام نے ''الیوم یوم البرو الوفا'' کے اصول عام کا نفاذ فرمایا۔ قریش سے، جن کے تشدد و تعذیب کے باعث امت مسلمہ کو جلا وطن ہونا پڑا تھا، جب حضور نے پوچھا کہ ''تم لوگ مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟'' تو ان گمراہوں نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ کیسا صحیح جواب دیا: ''نیک سلوک کی، کیوں کہ آپ مہربان بھائی، اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں''۔ طبری لکھتا ہے کہ قریش کے اس طرز کلام پر رسول اطہر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آپ نے فرمایا: ''آج میں بھی تم سے وہی کہوں گا، جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا:

لا تثریبَ علیکم	آج تم پر کوئی الزام نہیں،
الیوم یغفر اللہ لکم	خدا تمہیں معاف کرے کہ
و ھو ارحم الراحمین○	وہ بڑا ھی رحم کرنے والا مہربان ھے۔

اگر ایک اتفاقی حادثے سے، جسے خود قریش کی شرارت نفس نے پیدا کیا تھا، قطع نظر کیا جائے تو خون کا ایک

قطرہ بہائے بغیر کسی شہر کو فتح کرنے کی یہ مثال اپنی نظیر آپ ہے - وہ غیور قبائل جن کی آتش غضب بات بات پر بھڑک اٹھتی تھی ، صرف ایک انسان کے روحانی تصرف کی بدولت ، کس صلح و سکون کے ساتھ اپنے دشمنوں کے جم غفیر کو چیرتے ہوئے ، قریۂ مقدسۂ ابراہیم میں داخل ہو رہے تھے ! چند ہی سال بعد چشم فلک نے ایک اور محترم شہر میں ایسے ہی پرامن داخلے کا نظارہ دیکھا - بیت المقدس میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ اسی شان کے ساتھ داخل ہوئے جس کا اولین جلوہ فتح مکہ کے دن دنیا دیکھ چکی تھی - اب بھی وہی ادائے انکسار دلوں کو لبھا رہی تھی ، اب بھی فاتح اسی طرح ایک اونٹ لیے ہوئے ، جس کی سواری میں وہ اور اس کا غلام برابر کے حصہ دار تھے ، اپنے مفتوح شہر کے اندر حلم و تواضع کی تصویر بنا ہؤا داخل ہؤا - نہ کوئی خونریزی ہوئی اور نہ ہنگامہ و فساد - فقط اتنا ہؤا کہ خلیفۂ اسلام مسیحی بطریق سوفرونیس کے ساتھ باتیں کرتا ہؤا اندر چلا آیا اور شہر خدا کے ہاتھوں میں تھا ! لیکن حروب صلیبیہ کے زمانے میں جب شہزادۂ امن کے پرستار جو آج ہمیں تشدد کا الزام دیتے ہیں ، اس بلدالانبیاء کے اندر داخل ہوئے تو ان کے چند روزہ تسلط کے دوران میں (یہاں میں ایک عیسائی اہل قلم کے الفاظ نقل کرتا ہوں) ''خورد سال بچوں کو دیواروں کے ساتھ پٹک کر ان کے مغز پاش پاش کیے گئے - شیر خوار معصوم ، فصیلوں کے اوپر سے نیچے پھینک دیئے گئے - لوگ آگ کے شعلوں میں کباب سیخ کی طرح بھون ڈالے گئے - بعض آدمیوں کا پیٹ یہ دیکھنے کے لیے چاک کیا گیا کہ شاید انھوں نے سونا نگل رکھا ہو - یہودیوں کو اپنے معبد میں گھسنا پڑا جہاں

سب کے سب جلا دیے گئے - تقریباً ستر ہزار آدمیوں کا قتل عام ہوا اور خود جناب پاپائے اعظم کے نمائندے نے اس جشن میں حصہ لیا“ -[1] یہ صرف اس لیے کہ ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں کوئی حربی نمونہ نہ تھا اور خالص دنیوی معاملات اور مقتضیات حکومت کے لیے انھیں رومتہ الکبریٰ کی مشرک سلطنت کے نقش قدم پر چلنا پڑا کہ یورپ کے تمام ممالک کا سیاسی شجرۂ نسب اسی بت پرست حکومت سے ملتا ہے - مگر جب رسول غازی اور نبیّ مجاہد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نمائندہ صلاح الدین ایوبی دوبارہ مدینتہ الرسول میں خدا کی رحمتوں کا پیغام لایا تو اس نے تمام مسیحیوں کو آزاد کر دیا اور انھیں نقدی اور خوراک دے کر امن و عافیت سے رخصت ہو جانے کی اجازت دی ، کیونکہ اسلام اپنے مفتوحوں کے ساتھ ہمیشہ سے ایسے ہی حسن سلوک کا خوگر رہا تھا -

فتح مکہ کے بعد آنحضرت نے مہاجرین مظلومین کو ان کی غصب شدہ جائدادیں بھی واپس نہ دلائیں[2] - خود حضور کے پدری مکان پر عقیل ابن ابی طالب نے جو ہنوز نا مسلمان تھے ، قبضہ کر رکھا تھا مگر جب لوگوں نے پوچھا : ”کیا حضور اپنے دولت خانے پر قیام نہ فرمائیں گے ؟“ تو آپ نے فرمایا : ”عقیل نے ہمارے لیے مکان کہاں چھوڑا !“[3] تمام صحیح اسلامی فتوح و محاربات میں عسا کر اسلام نے یہی پاک اصول پیش نظر

---

۱ - ”یورپ کی تاریخ ارتقائے ذہنی“ مصنفہ ڈاکٹر ڈریپر -

۲ - زادالمعاد -

۳ - سیرت شبلی -

رکھا ۔ مسلمانوں کی تاریخ کشور کشائی خلافت راشدہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے اور عرب سے باہر پہلا قابل ذکر مقام جو اسلام کے قبضۂ اقتدار میں آیا ، حیرہ تھا ۔ حضرت خالد ابن ولید نے جو فتح مکہ کے بعد کے نظاروں سے درس بصیرت لے چکے تھے ، اہل حیرہ کو ہر طرح کی سیاسی و مذہبی آزادی عطا کی اور شہر کی عنان حکومت بدستور رؤسائے شہر کے ہاتھ میں رہنے دی ،گویا اُس مثال کا اتباع کیا کہ حضور شارع اسلام نے مکہ پر قابض ہونے کے بعد بیت اللہ کے موروثی کلیدبرداروں کو اُن کی معزز خدمت سے بے دخل نہیں کیا تھا ۔ باوصف حضرت خالد ابن ولید کی اس مسالمت و رواداری کے خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیق کی تاکید تھی کہ وادیٔ فرات کے کاشتکار اپنی زمینوں سے محروم نہ کیے جائیں ۔ جنگ کے مروّج مفہوم اور جہاد فی سبیل اللہ میں یہی فرق ہے ۔

*

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بعض نہایت سیاہ دل اور گمراہ کفار کو سخت سزائیں ضرور دی ہیں لیکن صرف اُس حالت میں جب اُن کی شقاوت ، حکم و ارشاد الٰہی کی بقا و استحکام کے لیے موجب خطر بن گئی - آپ کی صلح اور جنگ ، آپ کا حب اور بغض ، حقیقی معنوں میں خدا کے لیے تھا ، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول بالکل سچ ہے کہ حضور نے بجز تحفظ محارم الٰہی کی نیت کے ، کبھی کسی کو ذاتی ایذا و آزار یا ذاتی مظلومی و ستم کشی کی سزا دینے کے لیے ، اپنے دامان رحم کے سایۂ عطوفت سے نکال کر ، انصاف کی عدالت میں کھڑا نہیں کیا[۱] - نہ صرف ذاتی اشتدادات معاف کر دیے جاتے تھے بلکہ حضور رحمتہ للعالمین کا کرم ہر اُس خطا کا پردہ پوش ہو جاتا تھا جو اسلام اور خدا کے پیغام کے لیے مستقل طور پر خطرناک نہ ثابت ہونے والی ہو - حدیبیہ کا واقعہ ہے کہ اسّی آدمیوں نے علی الصبح کوہ تنعیم سے اتر کر نماز پڑھتے ہوئے مسلمانوں کو قتل کر ڈالنا چاہا لیکن سب کے سب خود گرفتار ہوگئے - حضور نے انہیں کسی قسم کی سزا دیے بغیر رہا کر دیا کیونکہ ان لوگوں سے اسلام کو ، بحثیت ایک دین و ملت کے مٹ جانے کا کوئی قائم و ثابت اندیشہ نہ تھا - ہندہ اور وحشی کی قساوت قلب سے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی دردناک شہادت کی یاد وابستہ تھی لیکن فتح مکہ

---

۱ - بخاری از مشکٰوۃ صفحہ ۴۴۲ -

کے بعد مکے کے خطاپوش فاتح کی رحمت نے ان دونوں شرمسار مجرموں کی خطا کاریوں کو ڈھونڈ نکالا اور ہبار بن الاسود کے ساتھ جو ایک لحاظ سے حضور کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کا قاتل تھا ، یہ دونوں بھی معاف کر دیے گئے ، ازبس کہ آپ جیسے فنافی اللہ انسان کے لیے ذاتی ایذا کا انتقام کلیتہً خارج از تصور تھا - میں نے اس مضمون کے آغاز میں ایک مقام پر لکھا تھا کہ ہر پیغمبر اپنے ساتھ ایک عظیم الشان روحانی قوت لاتا ہے جو اس کے ابنائے جنس کے دلوں پر ایک آسمانی لرزش طاری کر دیتی ہے - عرب میں یہ قوت اب کرشمہ سنج ہوچکی تھی - اس کا ایک جلوہ دنیا نے اس وقت دیکھا جب ذوالفقار حیدری ایک یہودی کی گردن تک پہنچتے پہنچتے رک گئی ، جس نے یہ سمجھ کر کہ اب آخری ساعت آ پہنچی ، حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے روئے مبارک پر تھوک دیا - وہی شمشیر جوہر دار جسے اس مزید تحریک اشتعال پر ، برق خاطف کی طرح گرنا چاہیے تھا ، اب نیام کے اندر تھی ، کیونکہ وہ جذبۂ حقہ جو شمشیرزن کے مقدس دل میں بسا ہوا تھا ، شاید ذاتی تکلیف کے خیال سے آلودۂ غیظ و غضب ہوچکا تھا اور یہ محال تھا کہ رسول اطہر کا ایسا سچا عقیدت مند نور ایمان کو شائبۂ نفسانیت سے ملوث کرے - یہودی زندہ رہا ، مگر یہودیت کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے لیے -

وصلی اللہ علیٰ نور کزو شد نور ہا پیدا

★

اسیران جنگ کے ساتھ حسن سلوک کی جو مثال حضور سرورِ دوجہاں صلعم نے قائم کی، دنیا کی حربی تاریخ آج تک اس کی نظیر پیش نہیں کرسکی - قیدیوں کی گرفتاری کے بعد آنحضرت سب سے پہلے اُن کے لباس کی فکر کیا کرتے تھے اور بسا اوقات انھیں فدیہ لیے بغیر رہا کر دیتے تھے - چنانچہ غزوۂ حنین کے بعد رسول اللہ صلعم اور رسول اللہ صلعم کے اُسوۂ طیبہ کی تقلید میں دوسرے مسلمانوں، نے مجموعی طور پر چھ ہزار قیدی اسی طریقے پر آزاد کر دیے تھے - قیدیوں کی تواضع عزیز مہمانوں کی طرح کی جاتی تھی - اُن کے آرام و آسائش کے لیے اپنی راحت و آسودگی کو قربان کرنے میں دریغ نہ کیا جاتا تھا - غزوۂ بدر کے ایک قیدی نے رہائی کے بعد اپنی اسیری کی کیفیت اس طرح بیان کی:

> "مسلمانوں پر اللہ کی رحمت ہو - وہ اپنے اہل و عیال سے اچھا ہم کو کھلاتے تھے اور اپنے کنبے سے پہلے ہمارے آرام کی فکر کیا کرتے تھے" -

لیکن انجمن جاہلیّتِ جدیدہ کے ہسپانوی رکن، نام نہاد تہذیب و تمدن کے اس دور میں آج بھی مغرب الاقصیٰ کے اسیر مجاہدینِ ریف کی گردنیں کاٹ دیتے ہیں اور بہیمیت کے جوش میں ان بےکسوں کی مظلومی سے مسرت اندوز ہونے کے لیے اُن کے سر ہائے بریدہ کے پشتے اور دیواریں بناتے اور اُن کی زبانیں اور کان کاٹ کر نوکِ سنگین میں پرو لیتے ہیں -

اس بربریت کے مقابلے میں جب ہم جنگ کے وہ شریفانہ اصول دیکھتے ہیں جو آنحضرتؐ نے قائم کیے تو بے اختیار زبان پر یہ الفاظ ربانی جاری ہو جاتے ہیں : ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم -

نجد کے رئیس ثمامہ بن اثال نے اسلام لانے کے بعد یمامہ سے مکے کی طرف غلے کی برآمد بند کر دی لیکن باوجود اس کے کہ اہل مکہ فریق مخالف کی حیثیت رکھتے تھے ، آنحضرتؐ نے ثمامہ کو حکم دیا کہ غلہ بھیجنا بدستور جاری رکھے - اسی ارشاد نبوی کا ایک کرشمہ یہ سمجھنا چاہیے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب اپنے عہد خلافت میں جنود مجاہدین کو بازنطینی طاقت کے خلاف روانہ کیا تو سرعسکر اسلام یزید بن ابوسفیان کو یہ نصیحت کردی کہ ''کھجور کے درختوں کا تباہ کرنا اور اناج کے کھیتوں میں آگ لگانا تمھیں منع ہے - کسی ثمر دار درخت کو نہ کاٹنا ، نہ جانوروں کا نقصان کرنا ، سوائے اُن کے جن کو تم قوت لایموت کے لیے ذبح کرو -''

*

اہل نظر جانتے ہیں کہ آنحضرت نے اس حیرت انگیز صلح پرور جنگی زندگی کا آغاز اسی صورت میں گوارا فرمایا جب کوئی دوسرا چارۂ کار نہ رہا ۔ اس حقیقت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ غزوۂ احد میں جب قریش کا پلہ بھاری رہا اور مسلمانوں کی قوت بظاہر ذرا ہی کم ہوتی ہوئی پائی گئی تو کفار جن کی ہمت بڑھ گئی تھی ، ہر طرف سے یورش کرنے لگے ۔ چنانچہ متعدد قبائل نے مبلغین اسلام کی مختلف جماعتوں کو فریب سے قتل کر ڈالا ، اور یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ یہود کی عداوت عملاً غزوۂ احد کے بعد ہی سے شروع ہوئی ۔ بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے واقعات کو معترضین نے شان پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے ۔ قطع نظر اس سے کہ ان قبائل نے حکومت وقت کے خلاف سازش کی تھی ، بلکہ بنی قریظہ نے ایام محاصرہ میں اقدام بغاوت کرکے اپنے جرم کو سنگیں تر بنا دیا تھا ، اور پھر اپنے ہی تجویز کیے ہوئے "حکم" حضرت سعد ابن معاذ سے اپنی قسمت کا فیصلہ کرایا تھا ، اس رمز کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نتائج و عواقب کو ملحوظ رکھ کر اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرتے تھے ۔ اگر اس فتنے کو اسی وقت دبا نہ دیا جاتا اور اس غفلت کے باعث بعد میں بے شمار بندگان خدا کا خون بہتا تو اس خون ریزی کا ذمہ دار کون ہوتا؟ مشہور انگریز ادیب اور معلم اخلاق جان رسکن کے بقول "فتنہ و فساد ایک ابدی قانون مرگ ہے" جس پر چند نفوس کا قتل بہر کیف

مرجّح اور افضل ہے - بنی قریظہ سے جو بجا اور حق بجانب سلوک کیا گیا ، وہ نہایت واضح طور پر الفتنۃ اشدّ من القتل کے اسلامی اصول کو نمایاں کرتا ہے - ایسے موقعوں پر صرف ایک ناعاقبت اندیشانہ قدم ایک پوری قوم کو تباہی و بربادی کے قعرعمیق میں گراسکتا ہے اور جذبۂ عفو و ایثار کے اظہار کی خاطر امن و آسائش کی حکومت کو اس طرح غارت کر دینے کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اس خیال سے خودکشی کرے کہ دنیا میں کھانے والوں کی بقدر ایک کے کمی ہو جائے اور بھوکوں کا پیٹ بھرے - لیکن اسلام اس قسم کی تباہ کن اخلاقی عیاشیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا - وہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور زندہ رہ کر دنیا کو موردبرکات و حسنات بنانا اس کا مطمح نظر ہے - اگر اس موقع پر آنحضرت بنو قینقاع و قریظہ کی غداری کو اپنے دامان کرم میں چھپا لیتے تو مسلمانوں کے فلسفۂ سیاست میں ایک ایسی مثال قائم ہو جاتی جس کی تقلید اُن پر فرض تھی - لیکن حضور شارع اسلام علیہ احسن التحیات جو اپنی امت کے استخلاف فی الارض کو دیکھ رہے تھے ، ایک ایسے غلط سیاسی و اخلاقی اصول کا نفاذ نہ فرما سکتے تھے جس سے تاسیس حکومت الٰہی کا تصور بھی خارج از امکان ہوجاتا ہے - بدھ مت اور مسیحیت کو اپنے بر خود غلط ''عدم تشدد'' پر ناز ہے - لیکن اگر اس دل فریب اصول پر عمل کیا جاتا تو جاپان آج جاپان نہ ہوتا ، نہ یورپ کی سراپا تشدد سلطنتوں کے باشندے ہمیں ''عدم تشدد'' کا درس دینے کے لیے آج موجود ہوتے - ان لوگوں سے اسلام صرف ایک سوال کرتا ہے :

''لم تقولون مالا تفعلون ؟''

★

یہ عجیب تماشا ہے کہ اہل یورپ حکومت و سلطنت جیسے اہم شعبۂ حیات کو مذہب کے اقتدار سے بے نیاز کردینے پر تلے ہوئے ہیں اور اس منطق کے مطابق مدینۂ منورہ میں حکومت اسلامیہ کے قیام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیوی مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں - اسلام ، بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کا ، میدان عمل آخر یہی عالم اخلاق و افعال ہے ، اور دین و دنیا کوئی دو جدا حقیقتیں نہیں - افراد کا متحد نظام تمدن اُن کی حکومت ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ من حیث فرد ایک خاص ضابطۂ حیات کے پابند ہونے کے بعد من حیث قوم کسی دوسرے آئین کے تابع ہوں - پس اگر کوئی مذہب سچا اور کامل ہے تو اُسے لازماً انسان کی انفرادی رہنمائی کے ساتھ اُس کی اجتماعی ضروریات کا بھی کفیل ہونا چاہیے اور اگر حیات انسانی کی انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں میں کسی قسم کا تضاد پیدا ہوجائے تو محال ہے کہ مذہب زیادہ عرصے تک اپنے خلوص و صداقت کو برقرار رکھ سکے - اسلامی حکومت اہل ایمان کے اعمال کی ہیئت اجتماعی کا پرتو ہے اور اُس کے بغیر مذہب کا قیام و استحکام ممکن نہیں - علامہ شبلی مرحوم نے بالکل ٹھیک کہا ہے :

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک ؟
چراغ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک ؟

حکومت کی قوت مذہب کے خلوص و صداقت کو برقرار رکھنے کے لیے کس حد تک ضروری ہے ، اس کا قیاس ڈاکٹر ڈریپر کے بیان سے ہوگا جو لکھتے ہیں :

"اشاعت اسلام اور اشاعت مسیحیت میں ایک بہت بڑا اہم فرق ہے - مسیحیت کو کبھی اتنی طاقت حاصل نہیں ہوئی کہ دولت روما کی بت پرستی کا قلع قمع کرسکتی - جس قدر اس کو ترقی ہوئی اسی قدر بت پرستی کا عنصر اس میں زیادہ ملتا گیا - ایک مذہب کی قدیم شکلیں زندہ ہو کر دوسرے مذہب میں آملیں اور نتیجہ یہ ہؤا کہ مسیحیت بت پرستی کے ساتھ مخلوط ہوگئی - لیکن عرب میں حضرت محمد صلعم نے قدیم بت پرستی کو ایسا مٹایا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رہا - جن عقائد کی آپ نے ، اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں نے ، تلقین کی اُن میں بت پرستی کا ڈھونڈے سے بھی سراغ نہیں ملتا" -

اسلام کی اسی شان جہاں بانی کے تصدّق میں آج کروڑوں فرزندان توحید کی گردنیں ایک خدا کے سوا اور کسی ذات کے سامنے نہیں جھکتیں - دوسری طرف کروڑوں ایسے بد نصیب بھی ہیں جو اپنی سجود پرور پیشانیوں کو نجاست شرک و کفر سے آلودہ کر رہے ہیں ! مسلمان اپنے ہادی صلعم کے اس آسوۂ حسنہ کی طرف سے خالی الذہن نہیں ہو سکتے کہ اس نے دین کے استحکام کے لیے حکومت کا قیام ضروری خیال کیا تھا اور وہ از روئے سنت نبوی یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ

خلافت اسلامیہ کے دینی مفہوم سے اس کی دنیوی حیثیت ناقابل انفکاک ہے۔

اس حکومت الٰہی کے قیام کا منشا و مقتضا کیا تھا ؟ نجران کے عیسائیوں کے فائدے کے لیے جو فرمان بارگاہ نبوت سے صادر ہؤا تھا اس میں بہت بڑی حد تک ہمیں اس سوال کا شافی جواب مل جاتا ہے۔ اسلام کا دامان رحمت مسلم اور غیر مسلم دونوں کی حفاظت کے لیے جائز حد تک پھیلا ہؤا ہے۔ وہ دنیا کے خوف کو امن سے بدلنے کے لیے آیا ہے۔ اس کی جنگ صلح کا پیغام اور اس کی تلوار امن کا پرچم ہے۔ وہ دنیا کے ہنگامہ و فساد کو مٹا کر حکم خدا کے اعلان و نفاذ پر مامور ہؤا ہے اور اشارۂ ایزدی کے مطابق اقامت صلوۃ ، ایتائے زکوۃ ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر[1] اس کے فرائض اولیٰ میں داخل ہیں۔ ان مقاصد مہمہ کی تکمیل اور پھر ایسی سرزمین میں جو صدیوں تک جاہلیت کا صنم کدہ بنی رہی تھی ، اسی خلق عظیم کی مقتضی تھی جس کا ظہور عرب کے گلیم پوش شہنشاہ سے ہؤا۔

*

---

۱ ۔ الذین ان مکّنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوۃ و آتوا الزکوۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور ۔ (سورۃ الحج)

حضورص کی ذات اقدس اس قدر متنوع ، اس قدر متفرق ، بلکہ بہ حالات ظاہر متخالف ، فضائل اخلاق کی جامع ہے کہ عقل اس وصل دہندۂ دین و دنیا کی داستان حیات پر نظر ڈال کر ششدر رہ جاتی ہے اور معاً یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ المانی فلسفی ہیگل کا نظریۂ اتحاد اضداد (جو زیادہ صحیح لفظوں میں ''نظریۂ متتمات'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے) عالم روحانیات کی ماورائے حکمت کارگاہ کے اندر بھی جاری و ساری ہے - بعض خصائل حمیدہ کی نوعیت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ عوام اس کے بادی النظری تناقض کی بنا پر اُن کو ناقابل اجتماع تصور کرتے ہیں - لیکن درحقیقت یہ مختلف اور متعدد قوائے اخلاق باہم تکملہ و تتمہ کا رابطہ رکھتے ہیں -

حضرت ابو سعید الخدری رحمۃاللہ علیہ کہتے ہیں کہ آنحضرتص دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے - کیسا دل نشین منظر ہوتا ہوگا کہ جب کوئی خطاکار سامنے آ کر معافی کا طالب ہوتا تو خود معاف کرنے والے کی گردن شرم سے جھک جاتی اور روئے انور پر فرط حیا سے سرخی دوڑ جاتی - ایسی عفیف اور بے لوث ، ایسی پر سکون اور خاموش طبیعت کے انسان کا رہنمائے عام کی حیثیت سے عرصۂ عمل میں نکلنا اور اس ہمت فرسا زندگی کی تمام مقتضیات کو علیٰ وجہ الکمال پورا کرنا اعجاز سے کم نہیں - انتہائی شرم و حیا اور خاکساری و فروتنی کو کسی عام رہنما کے لوازم حیات مثلاً خطابت وغیرہ سے بہت کم لگاؤ سمجھا جاتا ہے ، کیونکہ اس زندگی کے لیے جرأت و

جسارت اور تحکم و بے باکی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے -
رسول اللہ صلعم نے ان دو بظاہر متضاد حیثیتوں کو وصل دے
دیا اور تیرہ سو برس ہوئے زمانے نے دیکھا کہ ایک ہی انسان
دنیا کا سب سے بڑا ہادی اور حیائے کامل کا مظہر اتم بھی تھا -
وہی ایک انسان جس کا حلم و تحمل اپنے خادم کو اس کی پوری
مدت ملازمت میں ایک دفعہ بھی یہ کہنے کا روادار نہ ہوا
تھا کہ ''تو نے یہ کام کیوں کیا اور وہ کیوں نہیں کیا'' ؟[1]
جس کا حسن خلق معاملات ارشاد و ہدایت میں بھی اس قدر
ذکی الحس تھا کہ کسی شخص کی نا مطبوع حرکت پر اس کا
نام لیے بغیر فقط اتنا کہہ دیتا تھا کہ ''وہ کیسے لوگ ہیں جو
یہ کرتے ہیں !''[2] جو اپنی مروت کے ہاتھوں خود عقوبت میں
گرفتار ہونا گوارا کرتا تھا لیکن دوسروں سے یہ کہنے کا حوصلہ
نہ رکھتا تھا کہ تمھارے اس کام سے مجھے تکلیف ہوتی ہے[3] ،
اسی ایک انسان کے سامنے جب بڑے بڑے معزز عمائد قریش کی
درخواست آئی کہ قریشی مجرمہ فاطمہ بنت الاسود کا گناہ سرقہ ،
اس کی عزت نسب کا لحاظ کر کے معاف کردیا جائے ، تو وہ
از فرق تا بہ قدم جلال و جبروت الٰہی کی تصویر بن گیا ، اور
اس نے نہایت جوش سے کہا : ''بخدا اگر فاطمہ بنت محمد بھی یہ
کام کرتی تو میں ضرور حد جاری کرتا'' - خلق نبوی کے اسی
آسانی اعتدال کے صدقے میں وہی ایک شمشیر جو صاعقۂ عدل بن کر
عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث اور بنو قریظہ کی گردنوں

---

۱ - مشکوٰۃ صفحہ ۵۴۴ (روایت حضرت انس رض) -
۲ - شفا صفحہ ۵۲ (روایت حضرت عائشہ صدیقہ رض) -
۳ - یہی حقیقت اس آیۂ کریمہ کی شان نزول ہے : ان ذلکم کان
یوذی النبی فیستحی منکم واللہ لایستحی من الحق (سورۃ الاحزاب) -

پر چمکی تھی ، آیۂ رحمت بن کر ہبار بن‌الاسود اور وحشی اور کوہ تنعیم کی حملہ‌آور جمعیت کے سروں پر سایہ افگن ہوگئی -

انکسار اور تواضع کی یہ کیفیت تھی اور تکبر و خودپسندی سے اس درجہ احتراز تھا کہ مدینے کی ایک مجذوب سی عورت نے اپنے کسی کام کے لیے حضورص کو رستہ چلتے روک لیا تو شہنشاہ عربص دیر تک سر رہگزار بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا[1] - چھوٹے بچے شوق سے سرورکون‌ومکانص کے پاس آتے تھے - حضورص اُن کو گود میں بٹھاتے اور اُن کے ساتھ کھیلتے تھے[2] - اُن کے معصوم دلوں میں کبھی یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ جس شخص کے ساتھ ہم طفلانہ شوخیاں کرتے ہیں ، وہ دنیا کا سب سے بڑا انسان ہے - آپ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو بنی عبدالمطلب کے بچے آپ کے استقبال کے لیے خوش خوش بھاگتے ہوئے آئے اور آپ نے نہایت شفقت سے اُن میں سے ایک کو اُٹھا کر اپنے آگے اور ایک کو اپنے پیچھے سوار کر لیا[3] - ان حقائق پر اگر غور کیا جائے تو دنیا کے عام واقعات و مشاہدات کی رو سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جس مقدس انسان نے جذبۂ حلم و محبت کو اس حد تک فروغ دیا تھا ، اُس نے اپنا رعب اور دبدبہ بھی کھو دیا ہوگا لیکن یہاں بھی وہ وجود قدسی بیک وقت متقابل کی تکمیلی فضیلات سے بوجہ احسن بہرہ‌مند تھا اور اُس کے خلق انکسار کے اتمام کے لیے اُس کا وقار موجود تھا - چنانچہ فتح مکہ کے دن جب ایک شخص نے حضور رسالت

---

۱ - ذکر اسلام عدی بن حاتم در سیرت ابن ہشام -

۲ - بخاری صفحہ ۸۸۸ و صفحہ ۹۳۰ صفحہ ۹۳۳ وغیرہ -

۳ - بخاری صفحہ ۲۴۲ -

میں آ کر عرض کرنا چاہا تو جلال نبوی نے اُس کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا ۔ آپ نے اُس کو اس طرح تشفی دی : ''گھبراؤ مت ، میں کوئی بادشاہ نہیں ، ایک غریب قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی''[1] ۔

کہتے ہیں کہ شاعر کے دل میں سارے جہان کا درد ہوتا ہے لیکن جو غم اس عالم ہست و بود کے دھندلے نظاروں سے پیدا ہو ، اُسے اُس اندوہ اکبر سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی جو عالم باقی کے جلوۂ سرشار کا آفریدہ ہو ۔ ہر وقت کی شگفتہ روئی ، ہروقت کا تبسم ، ایسے شخص کا طبعی خاصہ نہیں ہوسکتا جسے بچپن ہی سے غور و فکر کی عادت ہو ، اور ایک زبردست حکمران ، مدبر ، اور سب سے بڑھ کر ایک پیغمبر ، کے اہم فرائض جس کے ذمے ہوں ۔ غور و فکر کی یہی عادت شعرا میں نالہ و فغاں کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اکثر حکماء کے لیے اُن کی ''فلسفیانہ ترش روئی'' یا کم از کم ایک مستقل اور دائمی محزونی و افسردہ خاطری کی علت بن جاتی ہے جس کے تاریک بادل اُن کی پیشانی پر ہمیشہ چھائے رہتے ہیں ۔ حضور خواجۂ ہر دوسرا اگرچہ غم و اضطراب کے دو جہان اپنے قلب پاک میں چھپائے ہوئے تھے ، چنانچہ صحیحین میں ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے : ''لوگو ! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا'' لیکن غم دو جہاں کا یہ بار عظیم بھی حضور ص کو اس حقیقت سے بے خبر نہ رکھ سکتا تھا کہ آپ کے صحابہ رض اور ملنے والے آپ ہی کے نور تبسم میں جیتے تھے ۔ اس لیے آپ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے[2] اور ہر شخص سے بہ خندہ جبینی

---

۱ - شفا صفحہ ۵۹ -

۲ - شمائل ترمذی صفحہ ۱۷ -

پیش آتے تھے - حضرت جریر ابن عبداللہ کا بیان ہے کہ قبول اسلام کے بعد میں بارہا حاضرخدمت ہؤا مگر یہ اتفاق کبھی نہیں ہؤا کہ حضورص نے مجھے دیکھا ہو اور تبسم کے انوار چہرۂ مبارک پر ہویدا نہ ہوئے ہوں - حضرت عبداللہ ابن حارث کا قول ہے کہ میں نے کسی شخص کو جناب رسالت مآبص سے زیادہ خوش‌خلق اور خوش مزاج نہیں دیکھا ، اور شفاء عیاض میں ہے کہ دشمن ہو یا کافر ، آپ ہر ایک سے بہ کشادہ پیشانی ملتے تھے - یہی وہ سحر تھا جس سے آپ کے مخالف بھی رام ہو جاتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار جب آنحضرتص کو ساحر اور جادوگر کہتے تھے تو ایک طرح سے حقیقت کے بہت قریب پہنچ جاتے تھے -

جس شخص کی تکریم و تعظیم اس حد تک کی جاتی ہو کہ اُس کا تھوک تک ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہو ، اُس کے وضو کا پانی بھی زمین پر نہ گرنے پاتا ہو ، اُس کی آواز کے بلند ہوتے ہی تمام دوسری آوازیں خاموش ہو جاتی ہوں ، اُس کے اشارۂ ابرو پر بڑے بڑے شریف و نجیب اور غیور و عالی مرتبت عقیدت‌مند نوکروں کی طرح دوڑتے ہوئے آتے ہوں[1] ، ایسے شخص کے دل میں اگر اپنے وقار منصبی کا خیال پیدا ہو جائے تو کچھ عجب نہیں - مگر یہاں کیا کیفیت تھی ؟ زید بن سعنہ جو اسلام لانے سے پہلے یہودی تھے، اُن سے آنحضرتص نے کچھ قرض لیا تھا اور اگرچہ ادائے قرض کی میعاد میں ابھی کچھ دن باقی تھے ، انھوں نے تقاضا کرتے وقت آنحضرتص سے سخت درشتی اور بد زبانی کا سلوک کیا - آنحضرتص خاموشی سے سنتے

---

۱ - بخاری صفحہ ۳۷۸ و صفحہ ۳۷۹ -

جاتے تھے اور مسکراتے تھے۔ حضرت عمرؓ برافروختہ ہوئے تو آنحضرتؐ نے انہیں روکا اور کہا : "عمر! مجھے تم سے یہ امید نہ تھی - تمہیں چاہیے تھا کہ اسے حسن تقاضا اور مجھے حسن ادا کی تاکید کرتے"[1] - یہی وہ اسباب تھے جو قیام حکومت اسلام کا باعث ہوئے ، کیوں کہ اس نصفت پژوہی کی خاطر یہودی اپنے سردار کعب بن الاشرف کو چھوڑ کر سرور دو جہاں محمد مصطفٰی کی عدالت میں آتے تھے جہاں اس ارشاد الٰہی کی تعمیل کی جاتی تھی :

وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ط ان اللہ یحب المقسطین ○	اور اگر تو ان (غیر مسلم لوگوں) میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر - بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے -

جن فضائل اخلاق کو کم تر درجے کے انسان اپنے نقص فطرت کی بنا پر متناقض اور ناقابل اجتماع خیال کرتے آئے تھے ، محمد رسول اللہ نے آن کے مزاج و ترکیب کو اعتدال پر لا کر ثابت کر دیا کہ وہ دراصل خلق انسانیت کی تکمیل و اتمام کرتے ہیں اور اس طرح تاریخ کائنات میں ، شاید پہلی اور آخری دفعہ ، ایک کامل انسان کا ظہور ہوا - ولیم میور کو اعتراف ہے کہ عیسائیت پانچ سو برس کی تعلیم و تلقین کے بعد بھی عرب کی وارستگی پر غالب نہ آ سکی - یہودیت اپنی مسلسل کوششوں

---

۱ - سیرت شبلی -

کے باوجود اس آزاد خطے میں ناکام رہی لیکن اب حالت ہی
کچھ اور تھی - رحمت الٰہی نے بالآخر ان آوارہ سر شتر بانوں
کو آگھیرا تھا - بھلا بجلی کے خزانے کو چھو لینے کے بعد بھی
کسی شخص کا سکون و جمود قائم رہ سکا ہے؟ یہ فرزندان صحرا،
اولین مرتبہ ایک انسان کامل کے رو برو تھے ، اور اس کی
روحانیت کے پیہم برق وش جلوے پورے عرب کی ہستی
کو لرزا رہے تھے -

انتقام کی رسم جاہلیت قدیمہ کا مایۂ ناز شعارقومی تھی - آنحضرت صؐ کی تعلیمات کے تصدق میں عفو و رحم کے ساتھ انسانیت کا ازلی پیمان ازسرنو استوار ہوا اور جاہلیت کے تمام دستور پیغمبر صؐ کے قدموں کے نیچے پامال ہو گئے - اس مبارک دور کا آغاز آپ نے اپنے خاندان سے کیا اور سب سے پہلے ابن ربیعہ بن الحارث کا خون معاف کیا - اسی طرح وہ تمام مجرمین بھی معاف کردیے گئے جو تیرہ برس تک بلکہ اس کے بعد بھی رسول اللہ اور آن کی امت پر ہر قسم کے ستم توڑ کر اپنے دل کے حوصلے نکالتے رہے تھے - دشمنوں سے خوں‌ریز انتقام لینے کا اصول جاہلیت قدیمہ و جدیدہ دونوں کے شعار مشترک کی حیثیت رکھتا ہے - البتہ دور قدیم کے اہل‌جاہلیت کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے ، وہی کرتے تھے - لیکن ارباب جاہلیت جدیدہ ، اپنا اصول حیات تو یہ بیان کرتے ہیں کہ نکوکار انسان کے دونوں گال طمانچوں کے لیے بنائے گئے ہیں مگر عملاً اپنے جذبۂ انتقام کی شان بہیمیت میں عرب قدیم کی ضلالت و جہالت کی " ارتقائی " پیداوار معلوم ہوتے ہیں - سر زمین فرنگ کے یہ " جدید قبائل " گزشتہ جنگ عظیم سے پہلے ایک معمولی سے قتل پر بھڑک آٹھے تھے ، اور اس طرح تاریخ روزگار کا وہ سب سے بڑا محاربہ برپا ہوا تھا جس کے سامنے ہنگامۂ بکر و تغلب کے افسانے گرد ہوکر رہ گئے - اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نسلی و وطنی تعصب کے لات و ہبل کے سامنے حرص و آز اور نخوت و نفسانیت کے پجاری ، یورپ میں

آج بھی سر بہ سجود ہیں ۔ بلا شبہ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ انسان ایک خاص گھرانے ، ایک خاص ملک ، ایک خاص قوم کا رکن ہونے کی حیثیت سے ایک مخصوص حلقے کا پابند ہے ، لیکن اس کا یہ محدود حلقۂ علائق و روابط خود ایک وسیع تر دائرۂ کائنات میں شامل ہے اور ایک ادنیٰ وحدت پر اعلیٰ اور وسیع تر وحدت کو قربان کر دینا صریح غلطی ہے ۔ شعوب و قبائل کی تقسیم محض انسان کی انفرادی حیثیت کی تعین اور شناخت کے لیے ہے تا کہ دنیا کے کارو بار تنظیم و ترتیب سے چلتے رہیں ، نہ یہ کہ اس فرق کو بنائے مخاصمت قرار دے کر انسان اپنے ہی ابنی نوع کی گردنیں کاٹنے لگے ۔ دنیا کے سب سے بڑے بت شکن نے کعبے کے تین سو ساٹھ بتوں کے ساتھ ، عصبیت نسل و وطن کے بت کو توڑ کر اس کی پرستش بھی ہمیشہ کے لیے حرام کر دی اور حجتہ الوداع کے خطبے میں اعلان کر دیا[1] : ''لیس للعربی فضل علی العجمی و لا للعجمی فضل علی العربی، کلکم ابناء آدم وآدم من التراب،،۔ اس ارشاد اقدس کی تقلید میں حضرت علی مرتضیٰ رض فرماتے ہیں کہ "ذمّی کا خون مسلمان کے خون کے مانند ہے" مگر بہ خلاف اس کے جاہلیت جدیدہ کی سب سے بڑی سلطنت کا ایک جلیل القدر رکن کہتا ہے کہ اس کی قوم کے کسی فرد کے خون کا ایک قطرہ تمام سلطنت ایران کے خون کے برابر ہے ۔ اللہ اکبر ! اسلام اور کفر میں کیسا عظیم فرق و تفاوت ہے !

آنحضرت صہ نے مکے کے بین القبائلی عقد مواخات میں نسلی تفریقات کی کشمکش غرور کو مٹا دیا اور مدینے کے مشہور تر

---

۱ - ''سیرت،، شبلی ۔

عقدِ مواخات میں ملکی و وطنی اختلافات محو کر دیے - چنانچہ زمانہ دیکھ چکا ہے کہ بارگاہ رسالت میں ابوبکرؓ اور عمرؓ اور علیؓ کے پہلو بہ پہلو صہیبؓ اور سلمانؓ اور بلالؓ بھی موجود تھے ، رحمت اللہ علیہم اجمعین - حضرت سلمان پارسی نژاد تھے مگر قبول اسلام کے بعد اُن سے کسی نے اُن کا حسب و نسب پوچھا تو انھوں نے جواب دیا : " سلمان ابن اسلام ابن اسلام -" میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ فتح مکہ کے بعد بنی مخزوم کی ایک عورت فاطمہ بنت الاسود نے چوری کی - قریش نے جو چاہتے تھے کہ معاملہ دب جائے ، حضرت آسامہ بن زید یعنی آسی غلام کے بیٹے کو اپنا وکیل بناکر آنحضرتؐ کے پاس بھیجا جسے کچھ ہی عرصہ قبل آن کا غرور نسل خاطر میں بھی نہ لاتا - حضورؐ نے غضب آلود ہوکر فرمایا : "بنی اسرائیل اسی لیے تباہ ہوئے کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے اور امراء سے در گزر کرتے تھے -"[1] اسی تعلیم پاک کے اتباع میں حضرت عمر فاروقؓ نے ثابت کردیا کہ اسلام کے دربار میں ایک عام مسلمان اور جبلہ بن الایہم غسّانی جیسے ذی شوکت رئیس برابر ہیں - سلطنت روما میں امراء اور عوام کی باہمی کشمکش دو صدیوں سے زیادہ عرصے تک جاری رہی تھی - چنانچہ رومیوں کو ان خانہ جنگیوں کی بدولت چوتھی صدی قبل مسیح کے نصف آخر تک اتنی فرصت بھی نہ ملی کہ بیرونی معاملات کی طرف متوجہ ہوسکتے - حضور ختم المرسلینؐ نے اپنی مثال حسنہ سے سیاست اسلام کی بنیاد ایسی مستحکم کردی تھی کہ اس قسم کے خطرات سے اسے آج تک سابقہ نہیں پڑا - دنیا کو معلوم

---

۱ - صحیح بخاری ، کتاب الحدود -

ہوچکا تھا کہ جن غلاموں کو وہ ذلیل و حقیر سمجھتی رہی تھی ، انھیں میں زیدرضؓ اور آسامہ اور بلالرضؓ بھی پیدا ہوسکتے ہیں - انھیں تعلیمات مقدسہ کے صدقے میں آج صرف اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے غلام مختلف زمانوں میں مشرق سے لے کر مغرب تک تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوتے رہے ، چنانچہ خود ہندوستان میں اسلامی حکمرانوں کا ایک سلسلہ جو خاندان غلامان کے نام سے مشہور ہے ، آنحضرتؐ کے قائم کردہ اصول مساوات کی نہایت روشن نشانی ہے - آنحضرتؐ نے اُن لوگوں کو جو ایک دوسرے کے دشمن تھے ، آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور جو دوست تھے اُن کی مودت کو پہلے سے زیادہ مضبوط اور پایدار کردیا - اسلام سے پہلے دو آدمیوں کے لیے وجہ اتحاد یہ تھی کہ ایک قوم کا خون دونوں کی رگوں میں دوڑتا ہے ، ایک ہی خاک نے دونوں کا خمیر ہستی اُٹھایا ہے ، لیکن آنحضرتؐ نے اپنے مقدس نمونے اور پاک تعلیم سے حبل المتین ایزدی کے اعتصام کو ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان واسطہ بنایا

فا صبحتم بنعمته اخواناً وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها	خدائے بزرگ و برتر کے احسان عظیم سے تم لوگ بھائی بھائی بن گئے حالانکہ تم ایک قعر آتش کے کنارے پر تھے جس میں گرنے سے اُس نے تمھیں روک لیا -

✶

ہنری جیمز کے ایک سبق آموز قصے میں ایک ایسے شخص
کی کیفیت بیان کی گئی ہے ، جو معاشرتی وجود تو رکھتا ہے
مگر کوئی خانگی وجود نہیں رکھتا ، یعنی عام صحبتوں میں اس
سے زیادہ خوش آیند اخلاق اور پسندیدہ اطوار کا آدمی اور کوئی
نہیں ملتا ، لیکن اس کے پیچھے پیچھے اگر اُس کے گھر کے
اندر چلے جاؤ تو وہ غائب ہو جاتا ہے اور بجز کپڑوں کے ایک
جوڑے کے اور کچھ نہیں رہتا ۔ تلبیس و نمود کی جس حقیقت
کی طرف اس قصے میں استعارۃً اشارہ کیا گیا ہے ، اُس کی جھلک
ہم اپنے گرد و پیش کے بہت سے مشہور اور بڑے بڑے آدمیوں
کی زندگی میں دیکھتے ہیں اور سچ پوچھو تو کسی انسان کے
لیے خانگی و غیر خانگی زندگی میں مطابقت پیدا کرنا نہایت عظیم
روحانی قوتوں کی مساعدت کے بغیر نا ممکن ہے ۔ اگر ہم کبھی
اپنے ہی ظاہر و باطن کا جائزہ لیں تو اپنی عبرت و بصیرت کے
لیے عجیب و غریب تناقضات کے کرشمے دیکھ سکتے ہیں ،
لیکن حضور خیرالانام صلی اللہ علیہ وسلم جیسے سرشار حق
کی زندگی میں اس دورخی کی گنجائش کہاں رہ سکتی تھی ؟
آپ کا ظاہر باطن اور باطن ظاہر تھا ۔ ہم میں سے کتنے ہیں
جو یہ چاہیں کہ ہمارے مخلّی بالطبع اوقات کی جزئی اور تفصیلی
تصویر دنیا کے سامنے پیش کی جائے ؟ مگر تمام عالم کے لیے
اکمل و احسن نمونۂ زندگی قائم کرنے والے انسان نے اپنی
ازواج مطہرات کو حکم دے دیا تھا کہ اُس کے حالات حیات
کو خواہ وہ اندرونی معاشرت و خانہ داری ہی سے متعلق ہوں،

دنیا تک پہنچا دیں ، کیونکہ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ
اُس کی ایک ایک حرکت ، اُس کی ایک ایک جنبش ، ہزاروں
لاکھوں اور کروڑوں انسانی اعمال و افعال میں منعکس ہوگی
اور شجر ایمان کی یہ سبز شاخیں پھولتی پھلتی ہوئی خود ابد پر
اپنا سایہ ڈال دیں گی - ہم شاید اپنی کمزوریاں دنیا کی نظر سے
پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں ، لیکن وہ عبادت نافلہ چھپ کر ادا
کرتا تھا کہ مبادا لوگ تقلید کریں اور امت مرحوم کو اس
قدر عبادت شاق ہو - تمام ازواج مطہرات میں آنحضرتؐ کو اگر
عائشہ صدیقہؓ سے ، باوجود حضرت صفیہؓ اور حضرت زینبؓ
کے حسن صورت کی افضلیت کے ، زیادہ تعلق خاطر تھا تو اس کی
بھی یہی علت تھی کہ فقیہانہ اجتہاد اور ذہانت کے اعتبار سے
جناب صدیقہ سب میں افضل تھیں اور حضورؐ کی حیات طیبہ کے
نکات و معارف کو سب سے بہتر سمجھتی اور سمجھا سکتی
تھیں - چنانچہ اپنی اسی قابلیت کی بدولت " خذنصف الدین
من الحمیرا" کے فرمودۂ نبوی کی مستحق ٹھہریں اور اسی وجہ
سے حضرت عمرؓ جیسے پر جلال خلیفہ نے مسائل میراث کے
بارے میں بارہا اُن سے استناد و استشارہ کیا -

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ہمارے گھر میں ایک ایک
مہینے تک آگ نہیں جلتی تھی اور رسولؐ اورر سولؐ کا کنبہ
کھجور اور پانی پر گزران کرتے تھے - یورپ والے کہتے ہیں کہ
آنحضرتؐ کی مساعئی حقہ (معاذاللہ) ہوس ثروت و سلطنت کے
لیے تھیں، لیکن اگر آپ کو ایسا ہی شہنشاہ بننے کی آرزو تھی
جو ان چھنے جو کی روٹی کھائے ، جو اپنے ہاتھ سے جوتیاں
سیئے ، جس کے کپڑوں کو تہہ بر تہہ پیوند لگے رہیں ، جس

کے اہل و عیال خود چکی پیسیں اور پیہم کئی کئی راتیں کھانا میسر نہ ہونے کے باعث بھوکے سو جائیں ، تو معترضین کا الزام یقیناً بجا اور درست ہے - جس شب شہنشاہ کونین ص کا وصال ہوا ، حضرت عائشہ رض نے پڑوس کے گھر سے چراغ کے لیے تیل منگوایا تھا اور حضور ص کی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن تھی - خدا کی شان یاد آ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کامل انسان جس کا تقدس فرشتوں کو شرماتا تھا ، با ایں ہمہ طہارت و تورع ، اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے محاسن آداب اور مکارم اخلاق کی دعا کرتا رہتا تھا - در حقیقت آپ کو دنیا کے حکمرانوں اور تاجداروں کے لیے بھی ایک آسوۂ حسنہ قائم کرنا تھا جس کی پیروی کی توفیق اگرچہ اکثر مسلمان سلاطین کو نہ ہوئی تاہم صرف ہندوستان کی تاریخ میں ناصر الدین محمود اور اورنگ زیب عالمگیر جیسے درویش صفت شہنشاہ گزر چکے ہیں جن کے اسلامی زہد و تقویٰ کے سامنے ہمارا سر عقیدت آج بھی خم ہوجاتا ہے - غرض کہاں تک کہا جائے :

شیریں تر از حکایت ما نیست قصۂ
تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم

✶

آسوۂ نبوی نے ہمارے لیے دنیا کے آن معاملات پر بھی روشنی ڈال دی جنھیں اکثر رہنمایان دین نگاہ استغنا سے دیکھنے کے خوگر ہیں ۔ دنیا کے اور کس مذہبی پیشوا نے اپنے متبّعین کو تحصیل‌علوم‌دنیوی کی ترغیب دی ہے ؟ لیکن محمد مصطفیٰ صلی‌اللہ علیہ وسلم نے جو دین و دنیا میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے آئے تھے ، طلب‌علم‌وہنر کی اہم دنیوی ضرورت کو بھی نظر انداز نہ کیا ۔ چنانچہ اسی دن جب پہلی مرتبہ سعادت‌جہاد مسلمانوں کے حصے میں آئی ، غنائم علم بھی ان کے قدموں میں ڈال دیے گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی علمی ترقیات کی داستان ، خلاف دستور عام ، ان کے قائد دین علیہ الف الف تحیات والسلام کے فیوض کے تحت میں آتی ہے اور حضور کے اسوۂ حسنہ کا کوئی مجمل تبصرہ بھی اس بحث سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ۔

ظہور اسلام کے وقت قریش جیسے مقتدر اور کثیرالنفوس قبیلے میں صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو کسی قدر لکھ پڑھ سکتے تھے اور جن کے نام علامۂ بلاذری نے الگ الگ لکھ ڈالے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب تلوار چلانے میں جتنے ہوشیار تھے قلم کے استعمال سے اتنے ہی ناواقف تھے اور غرور جاہلیت ہر قسم کی نوشت و خواند کو نگاہ‌حقارت سے دیکھتا تھا ۔ لیکن جب اسی جاہل قوم کے سامنے رسول اللہ صلی‌اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ آیا تو اس نے اپنی اعجاز‌نما کشورکشائی کی طرح علمی فتوحات کے میدان میں بھی ایک عجیب محیرالعقل

پیش قدمی کا جلوہ دکھایا ۔ پیغمبر خداص نے غزوۂ بدر کے بعد
اُن اسیروں کے لیے جو زر فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے ، یہ
تجویز کر کے کہ اولاد انصار کو کوئی علم یا ہنر سکھا دیں ،
علوم و فنون کی قدر دانی کی ایک معرکتہ الآرا مثال قائم کی تھی
اور اسی خصوص میں آپ کے متبعین کے لیے آپ کے چند
ارشادات تھے جن کا ماحصل یہ ہے :

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

حضورص کی اس عملی اور زبانی تلقین کے طفیل یہ شرف
اسلام کے حصے میں آیا ہے کہ اُس نے علوم دینی و دنیوی
کے تخالف و تناقض کو مٹا کر اُن کا اتحاد
نہ صرف ممکن بلکہ ثابت کر دکھایا اور نہایت سختی سے
دائرۂ اسلام کے اندر رہ کر مسلمانوں نے اولو الابصار کی عبرت
کے لیے مظاہر کائنات میں وہ آیات بصیرت پیدا کیں کہ ایک
دنیا کو ان سے سبق لینا پڑا ۔ ایک پیغمبرانہ مثال کے
قائم ہو جانے کے بعد ملت بیضا کے شہدا کا خوں اور علماء کی
روشنائی یکساں طور پر بنی نوع انسان کی خدمت میں صرف
ہونے لگی ۔ اگر اسلام نے محمود غزنوی کو بت شکنی کے
لیے سومنات بھیجا تو ابوریحان بیرونی کو بھی ہندوستان کی
اقلیم علم کی تسخیر کے لیے اُس کے ساتھ روانہ کر دیا ۔ یہی
خدمت زیادہ وسیع پیمانے پر مسلمانوں نے فلسفۂ یونان کے لیے
انجام دی اور آج یورپ کو اعتراف ہے کہ یونانی علوم و فنون
سے اُس کا تعارف رسول اُمّیص ہی کی اُمت کے توسط سے ہؤا ۔
اندلس میں جا بجا مکتب ، مدرسے ، دارالعلم اور بیت الحکمت

قائم ہوگئے تھے جن میں اطراف و اکناف عالم سے ہر مذہب و ملت کے ہزار ہا طالبان فن تحصیل علوم کے لیے چلے آتے تھے - خود دنیائے مسیحیت کا ایک پوپ (سلوسٹر دوم) مسلمانوں کی معارف نواز بے تعصبی کے ظل عطوفت میں پرورش پا چکا تھا اور یورپ کی بڑی بڑی درسگاہوں میں عربی زبان رائج تھی - ابن رشد اور ابو العاص اندلسی فلسفے میں یورپ کے اولین معلم خیال کیے جاتے ہیں - ابن خلدون نے پروفیسر نکلسن کے بقول یورپ کو فلسفۂ تاریخ سمجھایا اور ڈاکٹر ڈریپر کے نزدیک ابو موسیٰ جعفر کوفی نے علم کیمیا کے لیے وہی کار نمایاں کیا جو اس زمانے میں پریسٹلی اور لاواسیئے نے انجام دیا ہے - اس سلسلے میں علامہ ابومعشر بلخی اور محمد ابن جابر البطنی جیسے ماہران علم ہیئات ، تاریخ حیوانات کے مشہور مصنف الدمری اور اسی پائے کے بیسیوں مسلمان علماء کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں - ہر طرف علم کے چرچے تھے ، ہر جگہ حکمت کی گرم بازاری تھی - مامون ابن مامون فرماں روائے خوارزم گیارھویں صدی میں ایک ثانوی حیثیت کا اسلامی تاج دار تھا لیکن ۱۰۱۷ع میں جب سلطان محمود غزنوی نے اس کے علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کیا ، اس وقت ابو سہل مسیحی جیسے فلسفی ، ابو نصر عراق جیسے مہندس ، ابوالحسن خمّار جیسے طبیب اور بو علی سینا و بوریحان بیرونی جیسے مشاہیر عصر ، دربار خوارزم کی زینت تھے-

کیسا عظیم الشان معجزہ ہے کہ اونٹوں کے وہ حدی خواں ، جن کے جمود کا طلسم صدہا برس سے نہ ٹوٹا تھا ، یک بہ یک آتش بجان ہو کر اٹھے اور دنیا و دین اور حکمت

و اخلاق کے ہر شعبے میں زمانے کو درس دینے لگے - جاہلیت کے وہی فرزند جو شاید کشت و خون اور جدال و قتال کے ہنگاموں میں اپنی عمریں کھو دیتے ، ابوبکررض و عمررض اور عثمان‌رض و علی‌رض بن گئے اور آج لاکھوں اور کروڑوں دل ان کی عقیدت اور محبت سے لبریز ہیں - ایک نہایت ہی قلیل مدت کے اندر عرب کا نقشہ بدل گیا - گنگا کی روانی اب وہی ترانہ سنا رہی تھی جس سے مست ہوکر بحر اوقیانوس کی موجیں ساحل ہسپانیہ پر اپنا سر پٹک پٹک دیتی تھیں - ارض بطحا کے خشک اور بے برگ صحرا میں برق‌تجلی گری اور خس و خاشاک کو بھی منور کر گئی ، جس کے نورانی جلوے دہلی سے لے کر غرناطہ تک قدم قدم پر جھلکنے لگے - غزالی ، رازی اور ابوحنیفہ ، فارابی ، ابن‌سینا اور ابن‌رشد ، عالمگیر ، الپ‌ارسلاں اور عمر ابن عبدالعزیز جیسے بیسیوں پرستاران‌حق کے نام حیات جاوداں کے آسمان پر درخشاں ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں - یہ سب کس آفتاب کے پرتو تھے ؟ کون تھا جس نے دنیا کو تاریکی سے نکال کر روشنی کا ، ظلمت سے نجات دے کر نور کا راستہ دکھایا ؟ جاؤ حجاز کے بیابان میں پکار پکار کر یہ سوال دہراؤ ، اور پھر دہراؤ ، شاید فاران کی گھاٹیوں میں گونج پیدا ہو : "محمّد !"

یٰایها الذین آمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیماً ○

✶

کتابیات

١ - اسوۂ حسنہ	پروفیسر حمید احمد خاں	3.00
٢ - مغرب کے تنقیدی اصول	سجاد باقر رضوی	12.00
٣ - ایک سو نظمیں	اختر حمید خان	زیر طبع
۴ - اقبال - شخصیت اورشاعری	پروفیسر حمید احمد خاں	״
۵ - کایا کلپ	انتظار حسین	״
٦ - تیشہ لفظ	سجاد باقر رضوی	״
٧ - علامتوں کا زوال	انتظار حسین	״
٨ - دشمنوں کے درمیان شام	منیر نیازی	״

کتابیات
5 - ٹمپل روڈ ، لاہور